اِنکارِ حدیث
حق یا باطِل
مولانا صفی الرحمن مبارکپوری
تنظیم الدعوۃ الی القرآن و السنۃ
گوالمنڈی راولپنڈی

منکرین حدیث کے تمام بنیادی شبہات کا دوٹوک جواب

انکار حدیث

حق یا باطل؟

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

ناشر

تنظیم الدعوۃ الی القرآن والسنۃ، راولپنڈی

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلمۂ اولین

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلاَۃُ وَالسَّلاَمُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِہٖ مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ، وَعَلٰی آلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَمَنِ اھْتَدٰی بِھَدْیِہٖ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ، اَمَّا بَعْدُ:

یہ ۱۹۷۵ء کی بات ہے وسط ھند کے اضلاع سیونی اور بالا گھاٹ سے اطلاع آئی کہ وہاں انکار حدیث کے فتنے نے سر اٹھایا ہے، اور لوگوں میں ایک گونہ اضطراب پھیلا ہوا ہے۔ لہٰذا آپ حضرات آ جائیں۔ اس وقت میں جامعہ سلفیہ بنارس میں تھا۔ وہاں سے فروری ۱۹۷۶ء میں راقم اور حافظ نصر اللہ صاحب جونپوری اور استاد گرامی مولانا شمس الحق صاحب سلفی رحمہ اللہ نے اس علاقے کا رخ کیا، شبہات پر گفتگو ہوئی، اور بحمد اللہ فتنہ دم توڑ گیا۔

واپسی کے چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ کچھ اور جگہوں پر بھی اسی طرح کے شبہات پھیلائے جا رہے ہیں۔ راقم نے ان شبہات کی تردید میں سولہ صفحات کا ایک کتابچہ شائع کیا، جو اس طرح ہاتھوں ہاتھ نکل گیا کہ دو تین ماہ میں نئے ایڈیشن کی ضرورت پڑ گئی۔ مگر دوسرا ایڈیشن ابھی شائع بھی نہ ہوا تھا کہ مدھوپور، بہار سے نئے ''دلائل'' کے ساتھ ایک نیا مکتوب وارد ہوا جسے مکتوب نگار نے اپنا سرمایہ تحقیقات قرار دیا تھا، راقم نے علی الفور جواب قلمبند کیا اور سپرد ڈاک کر دیا۔ پھر فضا پر خاموشی چھا گئی۔ اور رسالہ اس تازہ جواب سمیت ترتیب دے کر کاتب کے حوالے کر دیا گیا۔ پھر ایک طولانی تقریر موصول ہوئی، جو ٹھیک اس مصرع کی مصداق تھی۔

وہی دیرینہ بیماری وہی نا محکمی دل کی

اس کا جواب بھی رسالہ میں شامل کرلیا گیا۔ یوں یہ رسالہ ''انکار حدیث'' کے تقریباً تمام بنیادی شبہات کے جائزے پر مشتمل ہوگیا۔ اگرچہ مذکورہ بالا حالات کی وجہ سے تصنیفی اور موضوعی ترتیب قائم نہ رہی۔

ادھر کچھ عرصہ سے پھر اس رسالہ کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے، اور ہندوستان و پاکستان کے مختلف حلقوں سے اسکی اشاعت کا مطالبہ ہورہا ہے، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس پر ایک نظر ڈال کر پریس کے حوالے کردیا جائے۔ **عَسَی اللہُ اَنْ یَّنْفَعَ بِہِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۔ وَلِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔**

صفی الرحمٰن المبارکفوری

۱۲؍رجب ۱۴۱۸ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کیا قرآن میں سب کچھ ہے اور حدیث کی ضرورت نہیں؟

انکار حدیث کیلئے سب سے اہم اور بنیادی نکتہ یہ تلاش کیا گیا ہے کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ کی تفصیل بیان کردی گئی ہے۔ اس لئے حدیث کی ضرورت نہیں۔ اس کے ثبوت میں قرآن مجید کے متعلق "**تبیاناً لکل شیء**" اور "**تفصیلاً لکل شیء**" والی آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جن کا مطلب توڑ مروڑ کر اور غلط سلط بیان کر کے یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں ہر مسئلہ کی تفصیل موجود ہے۔

منکرین حدیث اب ہمارا سوال سنیں، قرآن میں مردہ، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا ہوا جانور حرام قرار دیا گیا ہے اور **بھیمۃ الانعام** حلال کیا گیا ہے۔ **بھیمۃ الانعام** کی تفسیر قرآن میں ان جانوروں سے کی گئی ہے۔ اونٹنی، اونٹ، گائے، بیل، بکری، بکرا، بھیڑ اور مینڈھا لغت میں بھی **بھیمۃ الانعام** کی فہرست میں یہی جانور بتائے گئے ہیں۔

پہلا سوال: اب سوال یہ ہے کہ ان کے علاوہ دنیا کے بقیہ جانور حلال ہیں یا حرام؟ مثلاً کتا، بلی، گیدڑ، بھیڑیا، چیتا، شیر، تیندوا، بندر، ریچھ، ہرن، چیتل، سانبھر، بارہ سنگھا، بھینسا، خرگوش، کوا، چیل، باز، شکرہ، کبوتر، مینا، فاختہ، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سارے جانور حلال ہیں یا حرام؟ یا ان میں سے کچھ حلال ہیں اور کچھ حرام؟ آپ جو جواب بھی دیں اس کا ثبوت قرآن سے پیش کریں۔ آپ کی عقلی تک بندیاں نہیں مانی جائیں گی، یعنی آپ چونکہ دعویدار ہیں کہ ہر مسئلہ قرآن میں موجود ہے اس لئے ان جانوروں میں سے جس کو حلال مانیں اس کے حلال ہونے کا ثبوت قرآن سے دیں۔ اور اگر آپ قرآن سے نہ دے سکیں (اور یقیناً نہیں دے سکیں گے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان نہیں

کیا گیا ہے اور حدیث کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ان جانوروں کے حلال وحرام ہونے کا قاعدہ حدیث میں بیان کردیا گیا ہے۔ جس سے فوراً معلوم ہوجاتا ہے کہ کون سا جانور حلال ہے اور کون سا حرام۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز کی حالت میں کھڑے ہونے، رکوع کرنے اور سجدہ کرنے کا ذکر بھی قرآن میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نماز میں پہلے کھڑے ہوں؟ یا پہلے رکوع کریں؟ یا پہلے سجدہ کریں؟ پھر کھڑے ہوں تو ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں یا لٹکا کر؟ ایک پاؤں پر کھڑے ہوں یا دونوں پر؟ لغت میں رکوع کا معنی ہے جھکنا، سوال یہ ہے کہ آگے جھکیں، یا دائیں جھکیں یا بائیں جھکیں؟ پھر جھکنے کی مقدار کیا ہو؟ ذرا سا سر نیچا کریں یا کمر کے برابر نیچا کریں یا اس سے بھی زیادہ نیچا کریں؟ پھر رکوع کی حالت میں ہاتھ کہاں ہو؟ گھٹنوں پر ٹیکیں؟ یا دونوں رانوں کے بیچ میں رکھ کر بازوؤں کو ران پر ٹیکیں؟ یا ڈنڈے کی طرح لٹکنے دیں؟ اسی طرح سجدہ کیسے کریں؟ یعنی زمین پر سر کا کون سا حصہ ٹیکیں، پیشانی کا ٹھیک درمیانہ حصہ یا دایاں کنارہ یا بایاں کنارہ؟ سجدہ کی حالت میں ہاتھ کہاں رکھیں؟ رانوں میں گھسالیں؟ یا زمین پر رکھیں؟ اور اگر زمین پر رکھیں صرف ہتھیلی زمین پر رکھیں یا پوری کہنی زمین پر رکھیں؟ سجدہ ایک کریں یا دو؟ ان سوالات کا آپ جو بھی جواب دیں اس کا ثبوت قرآن سے دیں۔ ان مسائل کے بارے میں آپ کی عقلی تک بندیاں نہیں مانی جائیں گی۔ اور اگر قرآن سے ان سوالات کا جواب نہ دے سکیں (اور یقیناً نہیں دے سکتے) تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حدیث کے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل نہیں ہوسکتا۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں زکوۃ وصول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نہ دینے والوں کو سخت عذاب کی دھمکی بھی دی گئی ہے۔ جس قسم کے لوگوں پر زکوۃ خرچ کرنی ہے ان کے متعلق بھی بتایا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ زکوۃ کب وصول کی جائے؟ یعنی زکوۃ روز روز

دی جائے؟ یا سال بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟ یا پانچ سال یا دس سال یا بیس سال میں دی جائے؟ یا عمر بھر میں ایک مرتبہ دی جائے؟ پھر یہ زکوٰۃ کس حساب سے دی جائے؟ اور کتنی دی جائے؟ یعنی غلہ کتنا ہو تو اس میں زکوٰۃ دی جائے؟ اور کتنے غلہ پر کتنی زکوٰۃ دی جائے؟ سونا یا چاندی کتنی ہو تو زکوٰۃ دی جائے؟ اور کس حساب سے دی جائے؟

یہ سارے مسئلے قرآن سے ثابت کیجئے۔ اگر آپ قرآن میں یہ مسائل نہ دکھلا سکیں (اور ہرگز نہیں دکھلا سکتے) تو ثابت ہو گا کہ حدیث کو مانے بغیر قرآن کے حکم پر بھی عمل ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ ان سارے مسائل کا بیان حدیث ہی میں آیا ہے۔

چوتھا سوال۔ قرآن میں حکم ہے کہ مسلمان جنگ میں کفار کا جو مال غنیمت حاصل کریں اس کے پانچ حصے کر کے ایک حصہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر الگ نکال دیا جائے جو یتیموں، مسکینوں اور حاجتمندوں وغیرہ میں بانٹ دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ باقی چار حصے کیا کئے جائیں؟ تمام مجاہدین پر برابر بانٹ دئے جائیں یا فرق کیا جائے؟ کیونکہ بعض لوگ اپنا ہتھیار، گھوڑا، تیر، کمان، نیزہ، بھالا، زرہ، خود، سواری کا جانور اور کھانے کا سامان خود لے کر جاتے تھے، اور بعض کو اسلامی حکومت کی طرف سے یہ سامان فراہم کئے جاتے تھے۔ اسی طرح بعض لوگ بڑی بہادری اور بے جگری سے لڑتے تھے، بعض دبکے رہتے تھے، کچھ اگلی صف میں رہتے تھے جن پر براہ راست دشمن کا وار ہوتا تھا۔ کچھ پیچھے رہتے تھے جو خطرہ سے دور رہتے تھے۔ اب اگر ان سب کو برابر دیں تو کیوں دیں؟ اور اس کا ثبوت قرآن میں کہاں ہے؟ اور اگر فرق کریں تو کس حساب سے فرق کریں؟ قرآن سے اس کا حساب بتائیے۔ اور اگر کمانڈر کی رائے پر چھوڑ دیں تو قرآن میں کہاں لکھا ہے کہ کمانڈر کی رائے پر چھوڑ دیں؟ اس کی دلیل دیجئے۔ اگر قرآن میں ان مسئلوں کا کوئی حل نہیں ہے تو کیسے کہا جاتا ہے کہ قرآن میں سارے مسئلے بیان کر دئے گئے ہیں۔

پانچواں سوال۔ قرآن میں حکم ہے کہ چوری کرنے والے مرد اور عورت کے ہاتھوں و

کاٹ دو۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں ہاتھ کاٹیں یا ایک ہاتھ؟ اور اگر ایک ہاتھ کاٹیں تو داہنا کاٹیں یا بایاں؟ پھر اسے کاٹیں تو کہاں سے کاٹیں؟ بغل سے، کہنی سے یا کلائی سے یا ان کے بیچ میں کسی جگہ سے؟ آپ جو جواب بھی دیں اس کا ثبوت قرآن سے دیں۔ اور اگر قرآن سے اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے تو کیسے کہتے ہیں کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے۔

چھٹا سوال۔ قرآن میں یہ ارشاد ہے کہ جب جمعہ کی نماز کیلئے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ و اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ سوال یہ ہے کہ جمعہ کے دن کب پکارا جائے؟ کس نماز کے لئے پکارا جائے؟ کن الفاظ کے ساتھ پکارا جائے؟ جس نماز کے لئے پکارا جائے وہ نماز کیسے پڑھی جائے؟ ان ساری باتوں کا ثبوت قرآن سے دیجئے۔ ورنہ تسلیم کیجئے کہ قرآن میں ہر مسئلہ بیان نہیں کیا گیا ہے۔

صاف بات یہ ہے کہ قرآن میں رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کی پیروی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور جو باتیں ہم نے پوچھی ہیں ان باتوں میں اور اسی طرح زندگی کے بہت سارے مسائل میں تنہا قرآن سے کسی طرح نہیں معلوم ہوسکتا کہ رسول اللہ ﷺ کا طریقہ کیا تھا۔ یہ طریقہ صرف حدیث سے معلوم ہوسکتا ہے۔ اس لئے جب تک حدیث کو نہ مانیں خود قرآن پر بھی عمل نہیں کر سکتے۔ فی الحال یہی سوال پیش کر کے ہم آگے بڑھتے ہیں۔

انکار حدیث کے اصولی دلائل:

اس ایک اصولی دلیل کا حال جان لینے کے بعد آیئے اب مدھو پوری محقق صاحب کی زبانی چند اور اصولی دلیلیں سنئے! اس کے بعد ہمارا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ موصوف نے خود ہی سوال قائم کیا ہے اور خود ہی جواب بھی دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

سوال :۔ دین میں مصطلحہ ''حدیث'' کا کیا مقام ہے؟

جواب :۔ کچھ نہیں۔

(ا) دین حق ہے۔ اور اس کی بناء علم و یقین پر ہے۔ جس کی شہادت خود اللہ اور اس کے سچے فرشتے دیتے ہیں۔

﴿ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا اَنْزَلَ اِلَيْكَ أَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَشْهَدُوْنَ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْداً﴾ (۱۶۶/۴)

(ب) دین عملاً محمد رسول الله والذين معه کے ذریعہ بطریق احسن مکمل ہو چکا۔

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (سورۃ المائدہ)

(ج) دین لوح قرآن پر لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً بدرجہ اکمل محفوظ ہو گیا ہے۔

﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ، فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ﴾ (سورۃ البروج)

برعکس اس کے ہماری حدیثیں سب یکسر ظنی، غیر یقینی اور روایت بالمعنی ہیں۔ دین سے اس کا کیا تعلق؟ ﴿ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئاً﴾ یعنی حق کے مقابلے میں ''ظن'' کا کوئی مقام نہیں ہے۔

﴿ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى﴾ (۲۳/۵۳)

یعنی یہ لوگ محض ''ظن'' کے پیچھے دوڑتے ہیں دراصل وہ اپنی من مانی کرتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ان کو ہدایت پہنچ چکی ہے۔

اور ایک مقام پر تو خاص کر مومنوں کو خطاب کر کے زیادہ ظن و گمان سے کوسوں دور رہنے کا حکم صادر کر دیا گیا ہے۔ بلکہ یہاں تک متنبہ کر دیا گیا ہے کہ بعض قیاس آرائیاں''

صریح" گناہ کے درجہ تک پہنچ جاتی ہیں۔

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾
(۱۲/۴۹)

وفات نبوی کے سینکڑوں سال بعد بعض ایرانیوں نے ادھر ادھر کی محض سنی سنائی اٹکل پچو باتوں (جنھیں اقوال رسول سے منسوب کیا جاتا تھا) کا ذخیرہ جمع کر کے انہیں متفرق و متضاد روایتوں کو "صحیح حدیث" کا نام دے دیا۔ اور بعد والوں نے بعض دینی اور سیاسی مصالح کی بنا پر اس کو (بزعم خویش) جزو دین سمجھ لیا، اور اس طرح تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن کا دروازہ اپنے اوپر بند کر لیا۔ اس سے قبل یہی روایتیں جب تک زید، عمرو بکر کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کرتی رہیں، ان کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، لیکن قید کتابت میں آنے اور ان پر "صحیح" کا لیبل چپکانے کے بعد انھیں "فلاں نے فلاں سے کہا" اور" فلاں نے فلاں سے سنا" روایتوں کو بدقسمتی سے دین کی اصل و اساس سمجھ لیا گیا! حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ ہائے روایات زیادہ سے زیادہ ایک طرح کے نیم تاریخی مواد کی حیثیت رکھتے ہیں اور بس۔ (نیم تاریخی ہم نے اس لئے کہا کہ اولاً یہ فن تاریخ کے معیار پر پورے نہیں اترتے، اور دوسرے یہ کہ ان کتب احادیث کی اکثر روایات قصہ گویوں، واعظوں اور داستان سراؤں کی خودساختہ روایات اور من گھڑت کہانیاں ہیں۔ نیز ان جھوٹی روایات اور فرضی واقعات کا عوام میں خوب خوب پرچار کرنے کے ذمہ دار بھی یہی وعاظ و قصاص کا گروہ رہا ہے۔)

ہماری "حدیث" کا ایک دوسرا تاریک پہلو بھی ہے جو پہلے سے زیادہ افسوس ناک ہے۔ اور جسے "اسلامی تاریخ" کا "المیہ" کہنا چاہیے! مثلاً حدیث کے مجموعوں میں ایسی روایتیں بھی بکثرت ملتی ہیں جو الزام تراشی، دروغ بافی اور فحش نگاری کا مرقع ہیں! اس پر ستم ظریفی یہ کہ ان مخرب اخلاق اور حیا سوز "حدیثوں" کو منسوب کیا جاتا ہے قرآن کی برگزیدہ

شخصیتوں کی طرف (جیسے خود آنحضرت ﷺ، آپ کی ازواج مطہرات خصوصاً حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ اور اصحاب رسول علی الخصوص حضرت ابو بکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین) یا پھر سب وشتم کے تیر چلائے جاتے ہیں تو اگلی آسمانی کتابوں کی مثالی ہستیوں پر جیسے حضرت ابراہیم، یوسف، داؤد، سلیمان، اور مریم علیہم السلام وغیرہم۔ غرض صحف اولیٰ کی منتخب شخصیتیں ہوں یا صحیفہ آخر کی پسندیدہ ہستیاں کسی کی بھی عزت وآبرو راویان حدیث کی مشق ستم کا نشانہ بننے سے نہ بچ سکی ﴿وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ﴾ (۱۹/۷۷) واضح رہے کہ یہ روایتیں مسیلمہ کذاب یا ملا معین واعظ کاشفی جیسے مشہور دروغ گویوں کی نہیں ہیں۔ بلکہ عام مسلمانوں کے ''مایہ ناز'' اور ''فخر روزگار'' اماموں کے ''ثقہ'' راویوں کی ہیں جو آج تقریباً ہزار سال سے ان کتابوں کی زینت بنی ہوئی ہیں جو ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' اور ''مثلہ معہ'' سمجھی جاتی رہی ہیں! ع

وائے گردرپس امر و زبود فر دائے!

ان ''تحقیقات عالیہ'' اور ''فرمودات طیبہ'' کے بعد مدھو پوری ''محقق'' صاحب ایک ''ٹھوس حقیقت'' کا عنوان لگا کر مزید ارشاد فرماتے ہیں۔

ہم مکلف ہیں ایمان لانے کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر۔ اور اللہ و رسول پر ایمان لانے کے معنی ہیں اللہ کو حق جاننا اور محمد ﷺ (رسول اللہ) پر نازل شدہ کتاب (قرآن) کو ماننا۔ بخلاف اسکے محض سنی باتیں جو صدہا سال تک ہر کہہ و مہ کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کرتی رہی ہوں اور بالآخر انھیں محدثین نے بالکل غیر ذمہ دارانہ ذرائع سے معلوم کر کے اپنے بیاض میں نقل کی ہوں، ایسی غیر مستند اور غیر یقینی روایتوں کو اس صادق و مصدوق کی طرف منسوب کر کے انھیں سنت کا نام دینا اور ان پر ایمان لانے کے لئے مسلمانوں کو مجبور کرنا سراسر بے انصافی اور انتہائی زیادتی ہے!

مروجہ انجیل کا نسخہ جسے خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے قلمبند کیا تھا (جو سفر وحضر ہر حال میں آپ علیہ السلام کے رفیق وہم جلیس رہ چکے تھے) اگر محض اس لئے قابل اعتناء نہیں سمجھا جا سکتا کہ یہ کام حضرت مسیح کی موجودگی میں نہیں بلکہ واقعہ رفع کے چالیس سال کے بعد انجام پایا تھا۔ تو یہ روایتیں جنہیں نہ خود حضور ﷺ نے قلمبند کروایا۔ نہ ہی آپ کے اصحاب میں سے کسی نے اس کی ضرورت سمجھی۔ بلکہ حضور کے سینکڑوں سال بعد بعض عجمیوں نے زید، عمرو بکر سے پوچھ پوچھ کر لکھ لیا ہو انھیں منزل من اللہ ماننے اور جزو دین قرار دینے کے لئے وجہ جواز کیا ہو سکتی ہے؟ اور یہ تدوین وترتیب کے دوران تقویٰ وطہارت کا اہتمام یعنی ایک ایک روایت کو قلمبند کرنے سے پہلے تازہ غسل ووضو اور دو رکعت نفل ادا کرنے کا شاخسانہ نفسیاتی اعتبار سے ذہنوں میں روایتوں کی تقدیس وتکریم کا جذبہ خواہ کتنا ہی پیدا کرے لیکن نفس روایات کا جہاں تک تعلق ہے، یہ حقیقت ہے کہ اگر انھیں آب زمزم سے بھی غسل ووضو کر کے لکھا گیا ہوتا تو بھی اس عمل سے ان کی صحت وسقم میں کوئی فرق نہیں آتا۔

قرآن اللہ کا کلام ہے اس کا یقین کرنے کے لئے ہمیں رسول ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا ہوگا، بغیر آپ پر ایمان لائے قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لانا کسی درجہ میں معتبر نہ ہوگا۔ بعینہ اسی طرح روایتوں کو حدیث رسول ماننے کے لئے ایک ایک روایت کے راوی پر ایمان لانا ہمارے لئے ناگزیر ہوگا، بلکہ ہر روایت کے ہر سلسلۂ اسناد میں جتنے راوی ہونگے ہر ایک پر بلا استثناء ایمان لانا ہوگا! کیا ہمیں اللہ ورسول ﷺ کی طرف سے ان ان گنت اصحاب اسماء الرجال پر ایمان لانے کی تکلیف دی گئی ہے؟ انا للہ۔

جواب:

مدھوپوری ''محقق'' صاحب کا ''سرمایۂ تحقیقات'' ختم ہوا۔ اب آیئے اس پر ہمارا تبصرہ اور جائزہ ملاحظہ فرمایئے! ہم نے اس کے جواب میں انھیں لکھا تھا کہ آپ کا دعویٰ ہے کہ دین میں حدیث کا کوئی مقام نہیں۔ اور اس دعویٰ کی آپ نے اپنے خیال میں دو دلیلیں لکھی ہیں۔ دوسری دلیل پر تو ہم آگے گفتگو کریں گے۔

پہلی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دین کی بناء علم و یقین پر ہے۔ اور احادیث ظنی ہیں۔ اس ضمن میں آپ نے وہ آیات نقل کی ہیں جن میں ظن کی مذمت کی ہے اور ظن سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ آپ کی یہ حرکت دیکھ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ آپ حضرات نہ تو قرآن کو مانتے ہیں اور نہ اسے سمجھنے کا سلیقہ ہی رکھتے ہیں۔

شریعت میں ظن اور ظنیات کی حیثیت:

جناب عالی! قرآن مجید میں صرف ظن کی مذمت ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی تعریف بھی کی گئی ہے۔ اسے اختیار کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اسے مدار نجات بھی قرار دیا گیا ہے۔ سنئے، فرمایا گیا ہے۔

﴿لَوْلَا اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّ قَالُوْا هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ﴾ (سورۂ نور: ۱۲)

جب تم لوگوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کے واقعہ کو سنا تو مومن مردوں اور مومنہ عورتوں نے اپنے نفسوں کے ساتھ اچھا ظن کیوں نہ قائم کیا؟ اور کیوں نہ کہا کہ یہ کھلی ہوئی جھوٹی تہمت ہے۔

غور فرمایئے! اس میں صرف ظن کو اختیار ہی کرنے کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پر ایک معاملہ کے بارے میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کا بھی مطالبہ ہے۔ ایک جگہ فرمایا گیا۔

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴾ (سورۂ بقرہ)

صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو اور بیشک یہ بھاری ہے مگر ان ڈرنے والوں پر (نہیں) جو یہ ظن رکھتے ہیں کہ انھیں اپنے رب سے ملنا ہے اور یہ کہ وہ اسی کی طرف پلٹ کر جائیں گے۔

گویا قیامت کے وقوع اور اللہ سے ملاقات کا ''ظن'' رکھنا ایمان کی علامت ہے۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

﴿اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾

کیا وہ لوگ ظن نہیں رکھتے کہ وہ ایک بڑے دن کے لئے اٹھائے جائیں گے؟ (مطففین)

گویا بعث کا ظن نہ رکھنا عدم ایمان کی علامت ہے اور ڈنڈی مارنے جیسی برائیوں کا سبب ہے۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

﴿فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ الخ﴾

یعنی قیامت کے دن جس شخص کی کتاب اس کے دائیں ہاتھ میں دی جائے گی وہ کہے گا آؤ میری کتاب پڑھو۔ میں ظن رکھتا تھا کہ میں اپنے حساب سے ملوں گا۔ پھر وہ پسندیدہ زندگی یعنی بلند و بالا جنت میں ہوگا (الحاقہ ۱۹۔۲۲)

لیجئے جناب! یہاں ایک ظنی عقیدے پر جنت مل رہی ہے اور آپ ظن اور ظنیات کو جہنم میں دھکیلنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ظن کی بنیاد پر توبہ و استغفار کیا تو ان کے اس عمل کو مدح و تعریف کے سیاق میں ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ﴾

(سورہ ص: ۲۴:۲۵)

داؤد نے یہ ظن کیا کہ ہم نے اسے آزمائش میں ڈالدیا ہے پس انھوں نے اپنے رب سے مغفرت مانگی اور رکوع کرتے ہوئے گر پڑے اور اللہ کی طرف جھک گئے۔

آپ ظنی چیز کا دین سے کوئی تعلق ہی نہیں سمجھتے اور قرآن ظن پر دین کے ایک حکم کا دارومدار رکھتا ہے۔ارشاد ہے۔

﴿ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ﴾ (سورۃ البقرۃ)

یعنی مطلقہ ثلاثہ کا دوسرا شوہر اگر طلاق دے دے تو (پہلے شوہر اور اسکی مطلقہ) ان دونوں پر کوئی حرج نہیں کہ آپس میں تراجع کر لیں (یعنی پھر بذریعہ نکاح اکٹھا ہو جائیں) اگر یہ ظن کریں کہ وہ دونوں اللہ کی حدود قائم کر سکیں گے۔

غزوۂ تبوک میں جو تین مومنین خالصین بلا عذر شریک نہ ہوئے تھے ان کی توبہ بھی جس مرحلے کے بعد قبول کی گئی اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ کے ساتھ آیا ہے۔

﴿ وَعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴾ (توبہ:۱۱۸)

اور اللہ نے ان تین افراد کی توبہ بھی قبول کی جنھیں پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا یہاں تک کہ جب ان پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی اور ان کی جان پر بن آئی اور انھوں نے یہ ظن قائم کرلیا کہ اللہ کے سوا کوئی جائے پناہ نہیں۔ پھر اللہ نے ان پر رجوع کیا تاکہ وہ توبہ کریں۔ بیشک اللہ توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔

لیجئے جناب! کتنی صاف بات ہے کہ جب ان مخلفین نے حالات کا مزا چکھ لیا اور یہ ظن قائم کرلیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی جائے پناہ نہیں تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی۔ یعنی انہیں اللہ کی رحمت و مغفرت ان کے اسی ظن کے نتیجہ میں حاصل ہوئی۔ یہ تو یہ، اسلام نے اسلامی

عدالت کے تمام فیصلوں کی بنیاد صرف دو عادل گواہوں پر رکھی ہے، اس سے صرف زنا کا کیس مستثنیٰ ہے۔ لیکن ان دو عادل گواہوں کی عدالت وثقاہت کس درجہ کی ہوگی اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اگر وہ نماز کے بعد اللہ کی قسم اور اپنے اخلاص کا واسطہ دے کر گواہی دے رہے ہوں تب بھی قرآن نے ان کے بارے میں اس احتمال کو قبول کیا ہے کہ وہ جان بوجھ کر غلط بیانی سے کام لے سکتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو سورہ مائدہ آیات ۱۰۶۔۱۰۸)

بلکہ گواہی کے سلسلے میں مزید ایک قانونی شق یہ رکھی ہے کہ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کافی ہوگی (سورہ بقرہ۔۲۸۳) اور خود ہی یہ بھی بتلا دیا ہے کہ عورتوں کی تعداد ایک کے بجائے دو اس لئے رکھی جارہی ہے کہ

﴿ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰاهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰاهُمَا الْاُخْرٰى ﴾

اگر ایک عورت معاملہ کو بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔

یعنی ایسی گواہی بھی قبول کی جائے گی جو خود گواہی دینے والے کو یاد نہیں ہے۔ بلکہ گواہی دینے والا انسان دوسرے کی یاد دہانی کی بنیاد پر گواہی دے رہا ہے۔

کہئے جناب عالی! اس قسم کی گواہی ''یقینیات'' کے کس درجہ سے تعلق رکھتی ہے؟ اور یہ ڈھیل تو رہی نظام عدالت کے سلسلے میں، باقی رہیں خبریں' تو ان کے سلسلے میں اس سے بھی زیادہ وسعت اور گنجائش رکھی گئی ہے۔ حکم دیا گیا:

﴿ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْا ﴾

اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو الخ۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی صاحب تقویٰ اور صالح آدمی خبر لائے تو تحقیق بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔

کہئے جناب محترم! جب قرآن میں نہ صرف ظن کی تعریف کی گئی ہو بلکہ اس پر دین کے بعض احکامات کا دارومدار رکھا گیا ہو۔ اسی پر پورے نظام عدالت کی بنیاد رکھی گئی ہو، اسی ظن

کی بنیاد پر فیصلہ کن رائے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہو، اسی ظن کے تحت توبہ واستغفار کرنے والوں کی بخشش کی گئی ہو۔ حتیٰ کہ اسے آخرت میں نجات کا سبب قرار دیا گیا ہو۔ تو آپ کو یہ بات کہاں تک زیب دیتی ہے کہ آپ احادیث پر ''ظنی'' ہونے کی پھبتی چست کریں، اور دوسروں کو تفقہ فی الدین اور تدبر فی القرآن سے محروم قرار دیتے پھریں، دراں حالیکہ اس محرومی کے شکار درحقیقت آپ خود ہیں۔ محترم کہنا پڑتا ہے کہ:

ایاز قدر خود بشناش۔

شاید آپ اس موقع پر لغت کھول کر بیٹھ جائیں۔ اور چیخنا چلانا شروع کر دیں کہ دیکھو یہ شخص ظن کے مختلف معانی کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈ مڈ کر رہا ہے۔ اس لئے میں آپ کی اس چیخ و پکار سے بڑھ کر پہلے ہی یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ کار خیر میں نہیں، آپ انجام دے رہے ہیں۔ آخر اس سے بڑھ کر دھاندلی اور زبردستی کیا ہو سکتی ہے کہ آپ قرآن کی ان تمام آیات اور اسلام کے اس سارے نظام کو پس پشت ڈال دیں جن میں ''ظن'' کے مفہوم کو غلط رنگ دیتے ہوئے یہ فیصلہ ٹھونس دیں کہ ظن کے لئے دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے ذخیرۂ احادیث جو یکسر ظنی اور غیر یقینی ہے اس کا دین میں کوئی مقام نہیں۔ بتائیے! ہم نے جو آیات پیش کی ہیں ان کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ کے اس فیصلہ پر اس کے سوا کیا کہا جائے کہ ؎

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابدالدھر بماند

دین کے مکمل ہونے کا مطلب:

حدیث کے بے حیثیت اور بے مقام ہونے کے سلسلے میں آپ کی دوسری دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ دین عملاً محمد رسول اللہ والذین معہ کے ذریعہ مکمل ہو چکا ہے۔

اور قولاً لوح قرآن میں محفوظ ہو گیا ہے۔

غالباً آپ کے اس ''فنکارانہ'' استدلال کا منشا یہ ہے کہ اگر آپ سے یہ سوال کر دیا جائے کہ **محمد رسول اللہ والذین معہ** کے ذریعہ عملاً جو دین مکمل ہو چکا ہے اس کی تفصیلات کہاں دستیاب ہونگی تو آپ جھٹ کہہ دیں گے کہ قرآن میں۔ ممکن ہے آپ نہ کہیں لیکن آپ کے دوسرے ہم خیال حضرات یہی کہتے ہیں۔ اس لئے میں آپ کی توجہ اپنے ان سوالات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو اسی رسالے کے شروع میں درج ہیں۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں جن جانوروں کو حرام اور جن کو حلال قرار دیا گیا ہے، ان کے علاوہ بقیہ جانور حلال ہیں یا حرام؟ نماز کے متعلق قرآن میں جو چند چیزیں مذکور ہیں ان کے علاوہ نماز کے بقیہ حصول کی ترکیب کیا ہے؟ زکوٰۃ کم از کم کتنے مال پر فرض ہے؟ کتنے فیصد فرض ہے؟ اور کس وقت فرض ہے؟ مال غنیمت کی تقسیم مجاہدین پر کس تناسب سے کی جائے؟ چور کے دونوں ہاتھ کاٹے جائیں یا ایک؟ جمعہ کی نماز کے لئے کب اور کن الفاظ میں پکارا جائے؟ اور وہ کیسے پڑھی جائے؟

ان سوالات کو ایک بار غور سے پڑھ لیجئے اور بتایئے کہ اس سلسلے میں **رسول اللہ** صلی اللہ علیہ وسلم **والذین معہ** کا عمل کیا تھا؟ اور اس عمل کی تفصیلات کہاں سے ملیں گی؟ اگر ملیں گی تو کس سورہ، کس پارے، کس رکوع اور کن آیات میں؟ اور اگر قرآن میں یہ تفصیلات نہیں ہیں۔ اور یقیناً نہیں ہیں۔ تو قرآن کے بعد وہ کونسی کتابیں ہیں جو آپ کے ''معیار'' پر صحیح بھی ہیں اور ان میں یہ تفصیلات بھی درج ہیں؟

قرآن تو بڑے زور وشور سے کہتا ہے کہ جو اللہ سے امید رکھتا ہے اور آخرت میں کامیاب ہونا چاہتا ہے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ پر چلے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْآخِرَ﴾ (الاحزاب)

اور یہاں یہ حال ہے کہ جو مسائل پیش آتے ہیں ان میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ ملتا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں ملتا بھی ہے تو آپ اسے ''ایرانی سازش'' کے تحت گھڑا گھڑایا افسانہ قرار دیتے ہیں جن پر تقدس کا خول چڑھا کر لوگوں کو بیوقوف بنایا گیا ہے، ورنہ دین میں ان کی کوئی حیثیت اور کوئی مقام نہیں۔ اب آپ بتائیے کہ اللہ کی رضا اور آخرت کی کامیابی چاہنے والے بیچارے کریں تو کیا کریں؟

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں ؟

اس سلسلے میں سوالات اس کثرت سے ہیں کہ انھیں درج کرتے ہوئے آپ کے ملول خاطر کا اندیشہ ہے۔ اس لئے اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

اند کے باتو بگفتم و بدل ترسیدم
کہ آزردہ دل نہ شوی ورنہ سخن بسیار است

میری ان گذارشات سے یہ حقیقت دوٹوک طور پر واشگاف ہو جاتی ہے کہ یہ ساری دشواریاں اور پیچیدگیاں اس لئے پیش آرہی ہیں کہ سورہ مائدہ کی آیت ﴿ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ الخ﴾ اور سورہ بروج کی آیت ﴿ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيْدٌ الخ﴾ کا مفہوم سمجھنے میں آپ کے ''تدبر فی القرآن'' اور "تفقہ فی الدین" کا طائر پندار حقائق کی دنیا سے بہت دور پرواز کر گیا ہے۔

روایت بالمعنیٰ:

اب آئیے! آپ کے چند اور ''فرمودات عالیہ'' پر گفتگو ہو جائے، آپ نے حدیثوں کی بابت لکھا ہے کہ ''یہ سب کی سب یکسر ظنی، غیر یقینی اور روایت بالمعنیٰ ہیں''

یہ تو معلوم ہی ہے کہ ''غیر یقینی'' کا لفظ ''ظنی'' کی تفسیر ہے۔ اور ظن کے سلسلے میں میں اپنی گذارشات پیش کر چکا ہوں۔ رہا روایت بالمعنیٰ کا معاملہ تو سن لیجئے کہ روایت بالمعنیٰ

اگر کوئی جرم ہے تو اس جرم کا سب سے بڑا مجرم (نعوذ باللہ) خود قرآن ہے۔ نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا مکالمہ، ہود علیہ السلام اور ان کی قوم کا مکالمہ، صالح علیہ السلام اور قوم ثمود کا مکالمہ، ابراہیم اور لوط علیہما السلام اور ان کی قوم کا مکالمہ، حضرت شعیب علیہ السلام اور اہل مدین واصحاب الایکہ کا مکالمہ، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے، بلکہ جادوگروں سے اور بنی اسرائیل سے مکالمہ، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مواعظ ومکالمے کیا یہ سب انھیں الفاظ اور عبارتوں میں تھے، جن الفاظ اور عبارتوں کے ساتھ قرآن میں درج ہیں؟ کیا آپ اس تاریخی حقیقت کا انکار کر سکتے ہیں کہ ان پیغمبروں اور ان کی قوموں کی زبان عربی نہیں تھی؟

قرآن میں ایک ہی بات کہیں کچھ الفاظ وعبارت میں ادا کی گئی ہے تو کہیں دوسرے الفاظ وعبارت میں۔ کہیں مختصر ہے کہیں مطول، بلکہ کہیں ایک جزو مذکور ہے تو کہیں دوسرا جزو۔ پس اگر ایک بات کے بیان کرنے میں الفاظ وعبارت، اجمال وتفصیل اور اجزاء گفتگو کے ذکر وعدم ذکر کا اختلاف اور روایت بالمعنیٰ کوئی عیب ہے تو سب سے پہلے قرآن مجید کو اس عیب (نعوذ باللہ) سے پاک کیجئے۔ اور اگر نہیں تو پھر حدیث کے روایت بالمعنیٰ ہونے پر آپ کو اعتراض کیا ہے؟ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ قرآن تو روایت بالمعنیٰ سے بھرا ہوا ہے، پھر بھی یقینی کا یقینی، اور احادیث کے متعلق جوں ہی آپ کے کان میں یہ آواز پہنچے کہ اس میں کچھ احادیث روایت بالمعنیٰ بھی ہیں بس آپ شور مچانے لگیں کہ ہٹاؤ ان احادیث کو، یہ روایت بالمعنیٰ کی گئی ہیں۔ ان کا کیا اعتبار، اور دین سے ان کا کیا تعلق؟ سنئے جناب!

آئینہ دیکھئے گا ذرا دیکھ بھال کر
مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے

ایرانی سازش کا بدبودار افسانہ:

قرآنی آیات کو آپ نے اپنی مزعومہ خرافات کے گرد طواف کرانے کے بعد اس

بڑے بول کا مظاہرہ کیا ہے جسے منکرین حدیث کے گرگان باراں دیدہ اپنے سرد وگرم شیدہ یہودی صلیبی مستشرق اساتذہ کی تقلید میں بولتے آئے ہیں۔اور جس کے متعلق ہر صاحب بصیرت بے کھٹک کہہ سکتا ہے کہ

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ إِنْ يَقُولُونَ إِلَّا كَذِباً﴾ (الکھف)

بڑا بول ہے جو ان کے منہ سے نکل رہا ہے۔وہ سراپا جھوٹ بک رہے ہیں۔

اس بول کا خلاصہ یہ ہے کہ احایث کا ذخیرہ درحقیقت ایرانیوں کی سازش اور قصہ گویوں، واعظوں اور داستان سراؤں کی من گھڑت حکایات کا مجموعہ ہے۔

آپ کے اس دعویٰ کا پردہ فاش کرنے سے پہلے میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ اس عجمی سازش اور داستان سراؤں کی گھڑنت کا پتہ آپ نے کس طرح لگایا؟ آپ کے ذرائع معلومات کیا ہیں؟ اور آپ کے پاس اس پُرشور دعویٰ کی کیا دلیل ہے؟ کیونکہ

دعویٰ بلا دلیل قبول خرد نہیں

آپ لوگوں پر حیرت ہوتی ہے کہ دعویٰ تو کرتے ہیں اس قدر زور وشور سے، اور ایسے اونچے آہنگ کے ساتھ، اور دلیل کے نام پر ایک حرف نہیں۔کیا اسی کا نام ''تدبر فی القرآن'' ہے؟ اور اسی کو "**تفقه في الدين**" کہتے ہیں؟

آپ فرماتے ہیں کہ وفات نبوی ﷺ کے سینکڑوں برس بعد بعض ایرانیوں نے ادھر ادھر کی سنی سنائی اٹکل پچو باتوں کو جمع کر کے انھیں صحیح حدیث کا نام دے دیا۔انتھیٰ ملخصاً۔

میں کہتا ہوں کہ آیئے سب سے پہلے یہی دیکھ لیں کہ ان مجموعہائے احادیث کو جمع کرنے والے ایرانی ہیں بھی یا نہیں؟ سنہ وار ترتیب کے لحاظ سے دور اول کے رواۃ حدیث میں سرفہرست ابن شہاب زھری، سعید بن مسیب، عروہ بن زبیر اور عمر بن عبدالعزیز رحمہم اللہ کے نام نامی آتے ہیں۔یہ سب کے سب، سب سے معزز عربی خاندان قریش سے تعلق رکھتے ہیں۔

اورآخرالذکرتو اسلامی تاریخ کے پانچویں خلیفۂ راشد کی حیثیت سے معلوم ومعروف ہیں۔

اسی طرح دور اول کے مدونین حدیث میں سرفہرست امام مالک ہیں۔ پھر امام شافعی اوران کے بعد امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ، ان تینوں آئمہ کے مجموعہ ہائے احادیث پوری امت میں متداول اور مقبول ہیں۔ یہ تینوں خالص عربی النسل ہیں۔ امام احمد قبیلہ بنوشیبان سے۔ یہ بھی بتلادوں یہ بنوشیبان وہی ہیں جن کی شمشیر خاراشگاف نے خورشید اسلام کے طلوع ہونے سے پہلے ہی خسرو پرویز کی ایرانی فوج کو ذی قار کی جنگ میں عبرتناک شکست دی تھی۔ اور جنھوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں ایرانی سازش کے تحت برپا کئے گئے ہنگامہ ارتداد کے دوران نہ صرف ثابت قدمی کا ثبوت دیا تھا۔ بلکہ مشرقی عرب سے اس فتنے کو کچلنے میں فیصلہ کن رول ادا کر کے عربی اسلامی خلافت کو نمایاں استحکام عطا کیا تھا۔ اور پھر جس کے شہپر وشہباز مثنیٰ بن حارثہ شیبانی کی شمشیر خاراشگاف نے کارواں حجاز کیلئے فتح ایران کا دروازہ کھول دیا تھا۔

آخر آپ بتلا سکتے ہیں کہ یہ کیسی ایرانی سازش تھی جس کی باگ دوڑ عربوں کی ہاتھ میں تھی؟ جس کا سرپرست عربی خلیفہ تھا اور جس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کیلئے ایسی ایسی نمایاں ترین عربی شخصیتوں نے اپنی زندگیاں کھپادیں جس میں سے بعض افراد کے قبیلوں کی ایران دشمنی چاردانگ عالم میں معروف تھی؟ کیا کوئی انسان جس کا دماغی توازن صحیح ہو ایک لمحہ کے لئے بھی ایسے بدبودار افسانہ کو ماننے کے لئے تیار ہوسکتا ہے؟

دور اول کے بعد آیئے دور ثانی (صحاح ستہ) کے جامعین حدیث پر نگاہ ڈالیں۔ ان میں سرفہرست امام بخاری رحمہ اللہ ہیں جن کا مسکن بخارا تھا۔ بخارا ایران میں نہیں بلکہ ماوراء النہر (ترکستان) میں واقع ہے۔ دوسرے اور تیسرے بزرگ امام مسلم اور امام نسائی رحمہما اللہ ہیں۔ ان دونوں حضرات کا تعلق نیشاپور کے علاقے سے تھا۔ اور نیشاپور ایران کا نہیں بلکہ

خراسان کا جزو تھا۔ اگر اس پر ایران کا اقتدار رہا بھی ہے تو اجنبی اقتدار کی حیثیت سے۔ چوتھے اور پانچویں بزرگ امام ابوداؤد اور امام ترمذی رحمہما اللہ تھے۔ اول الذکر کا تعلق سجستان (خراسان) سے، ثانی الذکر کا تعلق ترمذ (ماوراء النہر، ترکستان) سے رہا ہے۔ چھٹے بزرگ کے بارے میں اختلاف ہے۔ ایک طبقہ ابن ماجہ کی سنن کو صحاح ستہ میں شمار کر کے انھیں استناد کا یہ مقام دیتا ہے۔ دوسرا طبقہ سنن دارمی یا مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شمار کرتا ہے۔ امام ابن ماجہ یقیناً ایرانی ہیں لیکن ان کی تصنیف سب سے نیچے درجے کی ہے۔ حتیٰ کہ اکثر محدثین اسے لائق استناد ماننے کو تیار نہیں۔ آخر الذکر دونوں حضرات عربی ہیں۔ امام مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور نسائی بھی عربی ہیں۔

کیا محدثین عجمی تھے؟

یہ حقیقت اچھی طرح یاد رہے کہ جن محدثین نے احادیث کو کتابی شکل میں جمع کیا ہے ان سب کو یا ان کی اکثریت کو عجمی قرار دینا فریب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج حدیث کی جو کتابیں امت میں رائج، مقبول اور متداول ہیں چند ایک کے سوا سب کے مصنفین عرب تھے۔ ہم ذیل میں اس طرح کے عرب محدثین کی فہرست دے رہے ہیں۔ تاکہ واقعی حقیقت دوٹوک طور پر واشگاف ہو جائے۔

عرب محدثین	وفات	قبیلہ
۱۔ امام مالک	۱۷۹ھ	ذی صبح
۲۔ امام شافعی	۲۰۴ھ	قریش
۳۔ امام حمیدی	۲۱۹ھ	قریش
۴۔ امام اسحاق بن راہویہ	۲۳۸ھ	بنو تمیم

۵۔امام احمد بن حنبل	۲۴۱ھ	بنوشیبان
۶۔امام دارمی	۲۵۵ھ	بنوتمیم
۷۔امام مسلم	۲۶۱ھ	بنوقشیر
۸۔امام ابوداؤد	۲۷۵ھ	بنوازد
۹۔امام ترمذی	۲۷۹ھ	بنوسلیم
۱۰۔امام حارث بن ابی اسامہ	۲۸۲ھ	بنوتمیم
۱۱۔امام ابوبکر بزار	۲۹۲ھ	بنوازد
۱۲۔امام نسائی	۳۰۳ھ	
۱۳۔امام ابویعلیٰ	۳۰۷ھ	بنوتمیم
۱۴۔امام ابوجعفر طحاوی	۳۲۱ھ	بنوازد
۱۵۔امام ابن حبان	۳۵۴ھ	بنوتمیم
۱۶۔امام طبرانی	۳۶۰ھ	لخم
۱۷۔امام دارقطنی	۳۸۵ھ	
۱۸۔امام حاکم	۴۰۵ھ	بنوضبہ

عجمی محدثین

۱۔امام ابن ابی شیبہ	۲۳۵ھ
۲۔امام بخاری	۲۵۶ھ
۳۔امام ابن ماجہ	۲۷۳ھ
۴۔امام ابن خزیمہ	۳۱۱ھ

اس فہرست سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جن محدثین کی کتابیں رائج اور مقبول ہیں ان میں ۱۸ عرب اور صرف ۴ عجمی ہیں۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی رفیق دارالمصنفین اعظم گڈھ نے

پہلی صدی ہجری میں پیدا ہونے والے محدثین سے لے کر آٹھویں صدی کے آخر تک وفات پانے والے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کا تفصیلی ذکر تذکرۃ المحدثین نامی کتاب کی دو جلدوں میں کیا ہے۔ ان محدثین کی کل تعداد ستر ہوتی ہے۔ جن میں سے صرف ۱۲ محدثین کے متعلق یہ صراحت ملتی ہے کہ وہ عجمی تھے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کو عجمی یا ایرانی سازش قرار دینے میں کتنا وزن ہے۔ اور یہ نعرہ کس قدر فریب ہے۔

اسی کے ساتھ اگر یہ بات بھی مدنظر رہے کہ کتب احادیث کے لکھنے والوں میں پیشرو اور سرفہرست عرب محدثین ہیں۔ عجمی محدثین ان کے بعد ہیں۔ پھر ان عجمی محدثین نے اپنی کتابوں میں جو حدیثیں جمع کی ہیں وہ حدیثیں ہیں جنھیں ان کے پیشرو اور ہم عصر عربوں نے اپنی کتابوں میں جمع کیا ہے تو مذکورہ بالا حقیقت مزید اچھی طرح بے نقاب ہو جاتی ہے۔

اب آپ بتائیے کہ آخر عربوں کے خلاف یہ کیسی سازش تھی جس کے دور اول کے تمام بڑے بڑے لیڈر عربی تھے۔ اور عربوں کے بعد ترکستانی اور خراسانی تھے۔ جو نسلاً عربی تھے۔ اور اگر عربی نہ بھی تسلیم کریں تو پھر ایرانیوں سے کد و رقابت رکھتے تھے۔ اور انھوں نے سازش کا سارا مواد اپنے پیشرو عرب لیڈروں سے حاصل کیا تھا۔ اگر بدقسمتی سے اس دور کے "سازشی ٹولے" میں ایک آدھ ایرانی نے شریک ہو کر ان کی کفش برادری اور خوشہ چینی کی بھی تو اس کو کوئی حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔ یا تو اس کی تصنیف کو درجہ استناد ہی نہیں دیا گیا۔ یا دیا بھی گیا تو سب سے نچلے درجہ کا؟

ہاں! ذرا یہ بھی بتلا دیجئے کہ آخر یہ کیسی "ایرانی سازش" تھی کہ "سازشی ٹولے" اور ان کے سیاسی آقاؤں کے درمیان برابر ٹھنی رہتی تھی؟ کسی کو شہر بدر کیا جا رہا ہے۔ کسی پر شہر کے دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ کسی کو حوالہ زنداں کیا جا رہا ہے۔ کسی پر کوڑے برس رہے ہیں۔ کسی کی زخمی پیٹھ پر زہریلے پھائے لگائے جا رہے ہیں۔ کسی کے پاؤں میں بیڑیاں

پہنائی جارہی ہیں۔ کسی کے کندھے اکھڑوا کر گدھے پر بٹھایا جارہا ہے اور شہر میں گشت کرایا جارہا ہے۔ اور کسی کے ساتھ کچھ اور ہورہا ہے۔

پھر ''سازشی ٹولہ'' بھی کیسا ہے کہ اپنے آقاؤں سے ذرا دبتا نہیں؟ ان کے مقابل میں اکڑا ہوا ہے۔ ان کے بچوں کے لئے اسپیشل کلاس لگانے پر آمادہ نہیں۔ عام درس میں نمایاں اور مخصوص جگہ دینے کو تیار نہیں۔ ان کے ہدایا اور تحائف کو پوری بے نیازی کے ساتھ ٹھکرادیتا ہے۔ اور ان کے دربار میں بھول کر بھی حاضر نہیں ہوتا۔ اگر کبھی حاضری کیلئے مجبور بھی کیا جاتا ہے تو وہ کھری کھری سناتا ہے کہ بلائیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ کیا یہی لچھن ہوتے ہیں سازشیوں کے؟

آخر یہ کیسا نادان ''سازشی ٹولہ'' تھا کہ جن سیاسی مصالح کے حصول کے لئے اس نے اتنی خطرناک سازش رچی تھی ان ہی سیاسی مصالح کے خلاف برسر پیکار رہا۔ اور اس راستے میں جو جو مصیبتیں جھیلنی پڑیں نہایت ہی استقلال کے ساتھ جھیلتا رہا۔

اس ''ایرانی سازش'' کا ایک اور پہلو بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اس سازشی ٹولے کی جمع کی ہوئی کتب احادیث میں ایسی احادیث بھی ہیں جن میں قبیلوں، قوموں اور ملکوں کے فضائل ومناقب یا خرابیاں اور کمزوریاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ اس قسم کی احادیث میں حجاز کو دین کی پناہ گاہ کہا گیا ہے (بخاری ومسلم وغیرہ) یمن کو ایمان وحکمت کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ (۱) (ایضا) شام کو اسلام کی چوٹی کی شخصیتوں کا مرکز، اللہ کی منتخب کی ہوئی زمین اور اسلام کا مستحکم قلعہ کہا گیا ہے۔ اور اس کے لئے دعائیں کی گئی ہیں (۲) (بخاری، مسلم،

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب المغازی: باب قدوم الاشعریین واھل الیمن (حدیث۔۴۳۸۸)۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان: باب تفاضل اھل الایمان فیہ۔ (حدیث۔۵۱۔۵۲)

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد: باب فی سکنی الشام (حدیث۔۲۴۸۲۔۲۴۸۳)۔ سنن الترمذی فی الاوخر کتاب المناقب (حدیث۔۳۹۵۳)۔ صحیح بخاری، کتاب الاستسقاء: باب ما قیل فی الزلازل والآیات (حدیث۔۱۰۳۸)

ابوداؤد، ترمذی، مسند احمد) لیکن جانتے ہیں مشرق کو عموماً اور ایرانیوں کے مرکز اقتدار (عراق) کو خصوصاً احادیث میں کیا مقام عطا ہوا ہے؟ اسے فتنہ وفساد کا مرکز اور اجڈوں اور اکھڑوں کا مسکن قرار دیا گیا ہے۔ اس پر قدرتی آفات اور تباہیوں کی آمد کی پیشین گوئی کی گئی ہے۔ اور اسے ابلیس کی قضائے حاجت کا مقام بتلایا گیا ہے۔ (۱) (بخاری طبرانی وغیرہ) اگر ایک آدھ حدیث میں اہل ایران سے متعلق کوئی فضیلت آ بھی گئی ہے تو صرف چند افراد کے لئے رجال من هؤلاء۔ (۲)

بتایئے! آخر یہ کیسے ''بدھو'' قسم کے ''سازشی'' لوگ تھے کہ سارے فضائل وکمالات تو عطا کر دیئے اپنے عرب دشمنوں کو؟ اور ساری پستی اور خرابی منتخب کر لی اپنے لئے اور اپنے آقاؤں کے لئے؟ کیا سازش اسی طرح کی جاتی ہے؟ اور کیا ایسی ہی الٹی سیدھی تدبیروں سے سیاسی بالادستی حاصل ہوتی ہے؟ ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

آیئے! آپ کو ایک اور حقیقت کی طرف متوجہ کروں۔ جسے مولانا محمد اسماعیل صاحب مرحوم آف گوجرانوالہ نے لکھا ہے۔ لکھتے ہیں:

''پھر آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ سرزمین حجاز سے شروع ہو کر اسلامی حکومت اقطار عالم تک لاکھوں مربع میل زمین پر پھیلی ہوئی تھی۔ آپ یہ سوچیں آپ کو صلح سے کوئی ملک ملا۔ خود سرزمین حجاز میں قدم قدم پر لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ مکہ پر فوج کشی کی ضرورت ہوئی۔ نجد لڑائی سے ملا۔ شام، عراق، حبش، یمن کے بعض علاقوں پر لڑنا پڑا۔ سمندر کے ساحلی علاقوں پر جنگیں ہوئیں۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب الفتن: باب قول النبی ﷺ الفتنة من قبل المشرق۔ (حدیث۔۷۰۹۲۔۷۰۹۴)
صحیح مسلم، کتاب الفتن: باب الفتنة من المشرق...... (حدیث۔۲۹۵)

(۲) صحیح بخاری کتاب التفسیر سورة الجمعة (حدیث۔۴۸۹۸) صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابة: باب فضل فارس (حدیث۔۲۵۴۶)

آنحضرت ﷺ کو اپنی زندگی میں کم و بیش بیاسی (82) جنگیں لڑنا پڑیں۔ پھر یہ جنگوں کا سلسلہ خلیفہ ثالث کی حکومت کے درمیانی ایام تک جاری رہا۔ پھر خلیفہ ثالث کے آخری دور سے شروع ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا پورا زمانہ قریب قریب باہمی آویزش کی نذر رہا۔ ۴۱ھ کے بعد جوں ہی ملک میں امن قائم ہوا خلفائے بنی امیہ نے شخصی کمزوریوں کے باوجود جہاد فی سبیل اللہ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہندوستان، اندلس، بربر، الجزائر، تمام علاقے جنگ ہی سے اسلامی قلمرو میں شامل ہوئے۔ پھر آپ کے قلم اور دماغ نے سازش کا نزلہ صرف فارس پر کیوں گرایا؟ محض ملک گیری اور فتوحات کی بناء پر بغاوتیں، سازشیں تصنیف کی جاسکتی ہیں تو حجازی سازش، ہندوستانی سازش، بربری اور اندلسی سازش کیوں نہیں بنائی گئی؟ کیا شام کے یہودی معصوم، عراق اور روم کے مشرک اور عیسائی فارسیوں سے زیادہ پاک باز تھے؟ ان کی حکومتیں مسلمانوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ نہیں اتریں؟ مصر میں اسلامی فتوحات سے قبطی اور مصری قوموں کا وقار پامال نہیں ہوا۔ پھر آپ مصری سازش کے متعلق کیوں نہیں سوچتے؟

اگر عقل کا دیوالہ نہیں دے دیا گیا تو اپنی فتوحات کی پوری تاریخ پر غور فرمایئے۔ چین کے سوا شاید ہی کوئی ملک ہے جہاں مسلمانوں کے خون نے زمین کو لالہ زار نہ کیا ہو۔ مغربی سمندر کے سواحل پر آپ کی فوجیں برسوں لنگر انداز رہیں۔ ان لوگوں پر آپ کو سازش کا شبہہ کیوں نہیں۔ آپ الٹا خود ہی ان کی سازش کا شکار ہو گئے۔

غزالی، ابن مکرم، ابن عربی، ابن العربی، شاطبی، ابن حزم، یحییٰ بن یحییٰ مصمودی وغیرہم، قرطبہ اور اندلس کے علماء کو سازشی نہیں کہا جاتا۔ اگر خراسان، بخارا، قزوین، ترمذ، نساء کے علماء پر حدیث سازی کی تہمت اس لئے لگائی گئی ہے کہ ان بزرگوں نے سنت کے پرانے تذکروں، صحابہ اور تابعین کی بیاضوں اور سلف امت کے مسودات سے تدوین حدیث کے لئے راہیں ہموار کیں تو علمائے اندلس نے بھی سنت کی کچھ کم خدمت نہیں کی کہ

شروح حدیث، فقہ الحدیث اور علوم سنت کی خدمت میں ان بزرگوں نے لاکھوں صفحات لکھ ڈالے۔ ان خدمات کو کیوں سازش نہیں کہا گیا۔ منکرین سنت کے پورے خاندان میں کوئی عقلمند نہیں جو ان حقائق پر سنجیدگی سے غور کرے، کیا علوم دینی اور فنون نبوت کی ساری داستان میں آپ کو صرف علمائے فارس ہی مجرم نظر آئے۔

من کان ھذا القدر مبلغ علمہ
فلیستر بالصمت والکتمان

(حدیث کی تشریعی اہمیت۔ ص ۷۹۔ ۸۱)

آیئے اس ''ایرانی سازش'' کے متعلق مولانا موصوف کے بعض اور تبصرے ملاحظہ فرماتے چلیے۔ مولانا موصوف کہتے ہیں:

''آج سے تقریباً ایک صدی پہلے حکومت نہ انتخابی تھی' نہ جمہوری نمائندگی کی سندان کو حاصل تھی۔ نہ وہ حکومتیں عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی تھیں۔ بلکہ اس وقت کی حکومتیں شخصی ہوتی تھیں۔ یا زیادہ سے زیادہ کوئی قوم حاکم ہو جاتی، باقی لوگ محکوم ہوتے تھے۔ اقتدار میں عوام کی جوابدہی قطعاً ملحوظ نہیں رکھی جاتی تھی۔ نہ حکومت کسی آئین کی پابند ہوتی تھی۔ بادشاہ کی رائے اور بادشاہ کا قلم پورا آئین ہوتا تھا۔ یا وہ لوگ جو بادشاہ کی ہاں میں ہاں ملا کر حکومت کے منظور نظر ہو جائیں۔

ایسی حکومتوں کے ساتھ ہمدردی ذاتی ضرورتوں کی وجہ سے ہوتی تھی۔ یا بادشاہ کے ذاتی اخلاق اور کیرکٹر کی وجہ سے۔ اگر کوئی انقلاب ہو جائے تو انقلاب سے ملک متأثر تو ہوتا تھا۔ لیکن اس کی وجہ بادشاہ یا اسکے خاندان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہوتی تھی، بلکہ یہ تاثر آنے جانے والی حکومتوں کے مقاصد کی وجہ سے ہوتا۔

فارسی حکومت شخصی تھی۔ یزدجرد کی موت پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔ یزدجرد کا خاندان یقیناً اس انقلاب میں پامال ہوا ہوگا۔ لیکن تاریخ اس وقت کی ایسی سازش کا پتہ نہیں دیتی جو اس

خاندان کے ساتھ ہمدردی کے طور پر کی گئی ہو۔

نوشیرواں کے بعد ویسے بھی کسریٰ کی حکومت روبانحطاط تھی، ان کے کردار میں عدل و انصاف کے بجائے استبداد روز بروز بڑھ رہا تھا۔ عوام کو حکومت کے ساتھ کوئی دلچسپی اور محبت نہیں تھی۔ پھر سازش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

مذہباً فارسی حکومت آتش پرست تھی۔ اسلام نے توحید کے عقیدہ کی سادگی سے یہودیت اور عیسائیت تک کو متاثر کیا۔ بت پرستی ان کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ آتش پرستی کی وہاں کیا مجال تھی۔ اسلام کی تعلیمات اس مسئلہ میں نہایت مدلل اور واضح تھیں، ان میں کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ تھی۔ اسلام کا موقف عقیدۂ توحید کے معاملے میں کھلی کتاب تھی۔ وہ دوسروں کے شبہات اور اعتراضات بڑی کشادہ دلی سے سنتا تھا۔ مخالفین کے شبہات کی تردید اور اصلاح میں کوئی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی اپنے نظریہ کو کسی پر جبراً ٹھونستا تھا۔ پھر اس کے خلاف کیوں سازش کی جائے؟ کون کرے؟ اور کس طرح کرے؟ فارسی حکومت کا چراغ خلیفہ ثانی کی حکومت میں گل ہوا۔ یزدجرد کو خود اس کی رعایا نے قتل کیا۔ اور اس کے خاتمہ میں مسلم عساکر کی مدد کی۔ پھر سازش کی ضرورت کیسے ہوئی؟

فارس کی فتح کے بعد ہزاروں فارسی اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ جزیہ دیتے رہے، انھیں کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ ان کے معبد (آتش کدے) مدتوں قائم رہے۔ جو لوگ ان سے اسلام کی طرف راغب ہوئے انھیں اسلام نے پوری ہمدردی کے ساتھ اپنی آغوش میں عزت کی جگہ دی۔

جہاں مذہب یوں آزاد ہو اور سیاست اس طرح بے اثر، ملک کے عوام مسلمانوں کی فتوحات پر خوشیاں مناتے ہوں، جب وہ جنگی مصالح کی بنا پر کسی مقام سے پیچھے ہٹنا پسند کریں تو اس علاقہ میں صف ماتم بچھ جائے۔ تعجب ہوتا ہے کہ ادارہ طلوع اسلام اور جناب اسلم جیراجپوری نے سازش کے جراثیم کو کون سی عینک سے دیکھ لیا۔

تاریخ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی عدل گستری اور انصاف پسندی کی وجہ سے فارسی بالکل مطمئن ہو گئے تھے۔ اس لئے فاتحین کی علم دوستی کے اثرات سے فارس کے تمام ذہین لوگ سیاست چھوڑ کر فوراً علم کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس راہ میں انھوں نے آخرت کی سربلندیوں کے علاوہ علمی دنیا میں بہت بڑا نام پیدا کیا، اور حکومت کے خلاف سازش کا ان کی زبان پر کبھی نام تک نہیں آیا۔

یہ سازش کا پورا کیس مولانا جیراجپوری کے کاشانہ اور ادارہ طلوع اسلام کے دفتر میں تیار ہوا ہے۔ واقعات کی روشنی میں اسے ثابت کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

سازش کی یہ عجیب قسم ہے کہ سازشیوں نے فاتحین کا مذہب قبول کیا۔ پھر ان کے علوم کی اس قدر خدمت کی کہ فاتحین اپنے علوم کی حفاظت سے بے فکر اور کلی طور پر مطمئن ہو گئے۔ پھر فاتحین نے ان میں سے اکثر علوم اور علماء کی سرپرستی کی [مقدمہ ابن خلدون/۵۸]

معلوم ہے کہ اموی خلفاء کے وقت شاہی درباروں میں عجمیوں کو وہ اقتدار حاصل نہ تھا جو عباسی درباروں میں برامکہ کو حاصل ہوا۔ لیکن اس کا دامن دین کی خدمات سے بالکل خالی تھا۔ قرآن وسنت اور دینی علوم تو بڑی بات ہے برامکہ سے تو عربی زبان کی بھی کوئی خدمت نہ ہوسکی۔

ہارون الرشید نے امام مالک رحمہ اللہ اور ان کے درس کی سرپرستی کی کوشش کی۔ لیکن امام مالک رحمہ اللہ اسے بے اعتنائی سے مسترد کر دیا، روپیہ دینے کی کوشش کی تو پورے استغناء سے واپس کر دیا۔

سازش کا آخر یہی مقصد ہوسکتا تھا کہ شاہی دربار تک رسائی ہو، مال و دولت اور حکومت میں حصہ ملے، اب دربار خود در دولت پر حاضر ہوتا ہے، اپنی ساری بلندیاں چھوڑ کر پورے انکسار، انتہائی احترام سے خزانوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ تھیلیاں با ادب پیش ہوتی ہیں، اور ''سازشی'' ہیں کہ نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے۔

بادشاہ عرض کرتے ہیں تشریف لے چلئے، آنکھیں فرش راہ ہونگی، فارسی سازش کے سرغنہ یا فن حدیث کے سالار قافلہ فرماتے ہیں وَالْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ مطلب یہ کہ اس بڑے دربار سے علیحدگی میرے لئے ناممکن ہے۔

پھر سازشیوں کا یہ پورا گروہ مختلف عجمی ممالک سے ہزاروں میل سفر طے کر کے مدینہ منورہ پہنچ کر امام کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے پیش ہوتا ہے۔ اور کوئی سوچتا نہیں کہ شیخ عرب ہے، یہ عجمی النسل کہیں پوری سازش کا راز فاش نہ کر دے۔

عرب استاد کے عجمی شاگرد مدتوں استفادہ کرتے ہیں اور انھیں علوم کا درس ہوتا ہے۔ ساتھی ساتھی پر جرح کرتا ہے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں کے کھلے بندوں تذکرے ہوتے ہیں۔ عرب محدثین عجمی علماء پر تنقید کرتے ہیں، عجمی اہل عرب کے نقائص کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن اس سازش کا سراغ جس کے اختراع کا سہرا ''طلوع اسلام'' کے دفتر پر ہے نہ کسی عرب کو لگا نہ کسی عجمی کو، نہ استاد نے اسے محسوس کیا' نہ شاگرد نے' نہ ساتھی نے۔

پھر تعجب یہ ہے کہ فارس کی فتح پہلی صدی کے اوائل میں ہوئی اور اس سازش کا منصوبہ تیسری صدی میں بنایا گیا۔ تقریباً پورے دو سو سال فارسی بے وقوف آرام کی نیند سوتے رہے۔ یعنی جب شکست کا درد اور کوفت تازہ تھی اس وقت تو فارسیوں کو کوئی احساس نہ ہوا۔ لیکن تین سو سال کے بعد درد کی بے قراریاں انگڑائیاں لینے لگیں۔ اور فارسی سازشیوں نے بخاری و مسلم اور کتب صحاح کی صورت اختیار کر لی' **فيا للعقول وأربابها۔**

پھر اتنی بڑی سازش جس نے اسلامی اور تعلیمی دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، دنیا کے مسلم اور غیر مسلم مؤرخوں کی آنکھیں بے کار ہو گئیں۔ قلم ٹوٹ گئے۔ اور زبانیں گنگ، ان کی ضخیم کتابیں اس عظیم الشان سازش کے تذکرے سے یکسر خالی ہیں۔ یہ راز سب سے پہلے یورپ کے ملحد مکتشفین پر کھلا۔ اور اسکے بعد دفتر طلوع اسلام کے دریوزہ گروں نے کچھ ہڈیاں مستعار لے لیں۔

﴿ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴾

(حدیث کی تشریعی اہمیت ص ۴۲ تا ۴۹)

ہماری ان گذارشات سے واضح ہو گیا کہ ایرانی سازش کا جو شاخسانہ آپ کے رہنماؤں نے چھوڑا ہے وہ کوئی ''ٹھوس حقیقت'' نہیں بلکہ ایک ''بد بودار افسانہ'' ہے جس نے اسلام کے دانا دشمن یہودی مستشرق گولڈسیہر اور اس کے رفقاء کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ اور حافظ اسلم، مسٹر پرویز اور پاکستان کے کچھ بے علم یا محدود العلم کلرکوں کی گود میں پل کر جوان ہوا ہے۔ اور اب آپ جیسے ''محقق'' حضرات اسے عام مسلمانوں کے حلق میں ٹھونسنے کیلئے اپنے ''سرمایہ تحقیقات'' کی حیثیت سے اس کی نمائش کرتے پھر رہے ہیں۔

خیر جناب! ''سازشی ٹولے'' نے پہلی صدی میں اپنی ''سازش'' کا آغاز کیا اور تیسری صدی کے اخیر تک مکمل کر لیا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اب ہزار برس بعد یعنی اب سے کوئی اسی برس پہلے آپ حضرات کے ہوش وحواس نے انگڑائی لی۔ اور یہودی و صلیبی مستشرقین کی خردبین لگا کر آپ حضرات نے یہ انکشاف کیا کہ یہ امت تو اپنے آغاز سے اب تک ''ایرانی سازش'' کا شکار ہے۔ یہ انکشاف بڑی دیر سے ہو سکا۔ اب یہ آوٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ اس کی حیثیت مشت بعد از جنگ کی ہے۔ اس لئے اسے شیخ سعدیؒ کے مشورہ کے مطابق آپ اپنے ہی کلے پر مار لیجئے۔ اتنی دیر کے بعد ایسے فوجداری مقدمات کی تفتیش نہیں ہو سکتی۔ اور نہ کوئی دانشمند اس موضوع پر سوچنے کی کوشش کر سکتا ہے۔

روایتوں کے متفرق اور متضاد ہونے کی حقیقت:

آپ نے روایتوں کو متفرق اور متضاد لکھا ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی غیر مسلم آپ سے یہ سوال کر بیٹھے کہ آپ کا قرآن ابتداء میں متفرق تھا یا مجتمع؟ اور اگر مجتمع تھا تو کس لوح پر؟ وہ لوح کہاں ہے؟ اسے کس نے دیکھا ہے؟ اور اس بات کی شہادت کیا ہے کہ

انھوں نے دیکھا ہے؟ پھر وہ شاہدین قابل اعتبار تھے بھی یا نہیں؟ انھوں نے اپنی شہادت کن کن لوگوں کے سامنے ادا کی؟ پھر ان لوگوں کی حیثیت کیا تھی؟ وھلم جرا، اگر آپ کے سامنے ایسے سوالات پیش کر دیئے جائیں تو آپ کیا جواب دیں گے؟ حدیث تو خیر "فلاں نے فلاں سے اور فلاں نے فلاں سے" کے واسطے سے حضور ﷺ تک پہنچ بھی جاتی ہے۔ مگر آپ لوح قرآن کے لئے تو اتنا بھی ثبوت فراہم نہیں کر سکتے۔

باقی رہا تضاد کا معاملہ تو یہ محض ایک "ہوا" ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ صحیح احادیث میں کوئی تضاد نہیں۔ ظاہر بینی کے لحاظ سے اگر آپ حضرات نے کچھ مثالیں فراہم کر لی ہیں تو ایسی مثالیں قرآن کے نہ ماننے والوں نے خود قرآن سے فراہم کی ہیں تو کیا آپ تسلیم کر لیں گے کہ (نعوذ باللہ) قرآن میں بھی تضاد ہے؟ پھر آپ حضرات اپنی "تدبر فی القرآن" کی مخصوص صلاحیت کو بروکار لاتے ہوئے قرآنی آیات کا جیسا کچھ مفہوم سمجھتے ہیں ان کے لحاظ سے تو قرآن مجید تضاد سے بھرا نظر آئے گا۔ مثال دیکھنی ہو تو پچھلے اوراق پلٹ لیجئے (اور اگلے صفحات میں بھی ملاحظہ فرمایئے گا) آپ کی پیش کردہ جن قرآنی آیات پر ہم نے بحث کی ہے وہ سب کی سب آپ کے بتلائے ہوئے مفہوم کے اعتبار سے خود قرآن ہی کی دوسری آیات سے ٹکرا رہی ہیں۔

روایات کی کتابت میں تاخیر:

آپ کو اس کا بھی ادعا ہے کہ روایتیں کتابت میں آنے سے پہلے زید، عمرو بکر، کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کر رہی تھیں، اور قید کتابت میں آنے کے بعد اس پر "صحیح" کا لیبل چسپاں کر دیا گیا۔ ان کی حیثیت نیم تاریخی مواد کی ہے وغیرہ۔

مجھے آپ لوگوں کی جرأت پر حیرت ہے۔ سنیئے! جن حوالوں کی بنیاد پر آپ قید کتابت

کی تاریخ متعین کرتے یا کر سکتے ہیں انھیں حوالوں کی رو سے یہ بات بالکل صاف اور قطعی طور پر عیاں ہے کہ احادیث کے قید کتابت میں آنے سے پہلے صرف دو طبقے پائے جاتے ہیں۔ایک صحابہ کرام کا طبقہ اور دوسرا تابعین عظام کا۔ پہلا طبقہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے **والذین معه** سے تعبیر کیا ہے۔اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جن کی عملی معیت کو شامل کر کے آپ دین کو مکمل مان رہے ہیں۔اور دوسرا طبقہ ان کے تربیت یافتگان کا ہے جسے قرآن نے **وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ** سے تعبیر کیا ہے۔کیا قرآن کے یہ دونوں مقدس طبقے آپ کی نگاہ میں ایسے ہی ایرے غیرے نتھو خیرے قسم کے ہیں کہ آپ انھیں زید' عمرو بکر جیسی اہانت آمیز تعبیر کا نشانہ بنائیں، اور اقوال وافعال رسول کے متعلق ان کی روایت اور بیان کو ایک کافر کی بے سند تاریخی روایت کے برابر بھی نہ سمجھیں؟

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

ہاں! یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ جن کتابوں اور حوالوں کی بنیاد پر آپ حضرات نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے کہ جن حدیثوں پر''صحیح'' کا لیبل چسپاں کیا گیا ہے۔وہ حدیثیں قید کتابت میں آنے سے پہلے زید، عمرو، بکر کی زبانوں پر بے روک ٹوک گشت کرتی تھیں، اور قصہ گویوں، داستان سراؤں اور واعظوں کی گھڑی ہوئی ہیں ان کتابوں اور حوالوں سے آپ حضرات اپنا دعویٰ قطعاً ثابت نہیں کر سکتے۔**وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا**۔ ان کتابوں اور حوالوں سے جو کچھ سمجھا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اسوۂ رسول ﷺ صحابہ کرام کے درمیان عملاً بھی محفوظ تھا اور قولاً بھی۔اور اس کے بعد والے طبقوں تک منتقل ہوا۔ پھر تدوین حدیث کے زمانے میں کچھ لوگوں نے اپنی مختلف النوع اغراض کے لئے حدیثیں گھڑیں۔ اور کوشش کی کہ اپنی گھڑی ہوئی احادیث کو اسوۂ رسول ﷺ یعنی صحیح احادیث کے ساتھ گڈمڈ کر کے اپنے دیرینہ مقاصد حاصل کر لیں۔مگر وہ اس میں بری طرح ناکام ہوئے۔شیعوں نے اہل بیت کے سیاسی تفوق کے لئے حدیثیں گھڑیں۔اباحیت پسندوں نے اپنی راہ ہموار

کرنے کیلئے اور عقلیت پسندوں نے اپنی عقلیت کو وجہ جواز فراہم کرنے کیلئے۔

گھڑنے والوں نے اپنی جعلی احادیث کی ترویج کا طریقہ یہ سوچا کہ کچھ مشہور اصحاب حدیث کی صحیح اور قوی سندوں سے ان جعلی احادیث کو روایت کریں تا کہ کسی کو ان کی صحت میں شک نہ ہو۔ لیکن جوں ہی یہ روایتیں اہل علم کے سامنے آئیں گھڑنے والے پکڑے گئے۔ کیونکہ کسی بھی بڑے محدث کے ہزاروں شاگرد ہوا کرتے تھے۔ اب ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص اس محدث سے ایسی حدیث روایت کرے جو ان ہزاروں شاگردوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہ ہو اور وہ اس پر بھی اس کا اعتبار کر لیں۔ ایسے راوی پر فوراً جرح شروع ہوتی تھی۔ پچیسیوں تنقیحات ایسی تھیں کہ کسی جعلساز کے لئے نکل بھاگنے کی کوئی راہ باقی نہ بچتی۔ تھوڑی سی زد وخورد کے بعد اسے ہتھیار ڈال دینے پڑتے۔ اور اپنی جعلسازی کا اقرار کر لینا پڑتا۔

محدثین نے حدیث کی صحت پرکھنے کیلئے ایسے سخت اصول وضوابط بنائے اور ایسا کڑا معیار مقرر کیا کہ دنیا آج تک اس کی نظیر نہ لاسکی۔ کوئی دس لاکھ افراد کی زندگیاں کھنگال کر رکھ دیں۔ پھر جملہ افراد کو اس کسوٹی پر پرکھ کر کھرا کھوٹا الگ کر دکھایا۔

تدوین حدیث کے تیسرے اور چوتھے دور میں ان جعلی احادیث کا ذخیرہ بھی تالیفی شکل میں باقاعدہ علیحدہ کر دیا گیا،، تا کہ راہ حق کے راہ رو کے لئے کسی بھی مرحلہ میں مشکل پیش نہ آسکے۔

یہ ہے واقعہ کی اصل صورت جو ان کتابوں اور حوالوں سے مستفاد ہوتی ہے جن کی بنیاد پر آپ حضرات نے ''ایرانی سازش'' کا بدبودار افسانہ تیار کیا ہے۔ اگر آپ کا ایمان بالقرآن آپ کو صدق ودیانت کی اجازت دیتا ہے تو واقعہ کو اس کی حقیقی صورت میں پیش کیجئے۔ اور قبول کیجئے، ورنہ اپنے دعویٰ کی دلیل لائیے!

آپ کے استدلال کی نوعیت بالکل یہی ہے کہ کسی گھر میں چور گھس جائے تو آپ گھر والے ہی کو چور کہنے لگیں، اور جب آپ سے ثبوت مانگا جائے تو آپ فرمائیں کہ ثبوت یہ

ہے کہ اس کے گھر میں چور گھسے تھے، یا کوئی پولیس پارٹی ڈاکوؤں کو گرفتار کر لائے تو آپ پولیس پارٹی کو ہی ڈاکو کہیں اور ثبوت یہ پیش کریں کہ انھوں نے ڈاکوں کو گرفتار کیا ہے۔

جناب والا! محدثین نے جعل سازوں سے کوئی حدیث روایت نہیں کی ہے۔ اور نہ اپنے ذخیرے میں ان کی روایات کو درآنے دیا ہے۔ بلکہ ان کی جعل سازی پکڑ کر لوگوں کو بتلایا ہے کہ فلاں نے فلاں سے روایتیں گھڑی ہیں۔ اس فرض شناسی پر خود محدثین اور ان کی روایتیں آخر مورد الزام کیسے ٹھہر گئیں۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

آپ نے ذرا آگے چل کر اسی سلسلے میں اناجیل اربعہ کی استنادی حیثیت کی کمزوری بھی بطور شہادت پیش کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے ذہن پر یہ ضابطہ کابوس بن کر مسلط ہو چکا ہے کہ کوئی بھی واقعہ اسی وقت قابل ہو سکتا ہے جب کہ وہ علی الفور قید کتابت میں آچکا ہو، صرف چند برسوں کی تاخیر بھی اسے مشکوک بلکہ ناقابل قبول بنا دینے کیلئے کافی ہے۔ اگر چہ درمیان کے ناقلین اور رواۃ کتنے ہی زیادہ مستند اور قابل اعتماد کیوں نہ ہوں، بلکہ خود واقعہ کے عینی شاہد ہی نے اسے کیوں نہ قلمبند کیا ہو۔

میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ کا یہ ضابطہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر قرآن مجید کی استنادی حیثیت سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام (قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم مدین واصحاب الایکہ، قوم ابراہیم، قوم لوط، قوم فرعون، قوم سبا وغیرہ) کے واقعات ان کے وقوع کے ہزار ہا برس کے بعد قلمبند کئے گئے ہیں۔ پھر آپ کے مذکورہ بالا اصول کی رو سے انھیں کیونکر مستند تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ ایک دشمن اسلام بالکل آپ ہی کے لب ولہجہ اور انداز گفتگو میں کہہ سکتا ہے کہ یہ سارے واقعات عرب قصہ گو اور داستان سرا، اپنی شبانہ محفلوں، قومی میلوں اور بازاری اجتماعات میں دارا و سکندر اور رستم واسفندیار کے قصوں کی طرح گرمی محفل کے لئے بیان کیا کرتے تھے۔ یہ محض عرب کی دیومالائی کہانیوں کا

حصہ تھے، ان کی کوئی حیثیت واہمیت نہ تھی۔ بلکہ یہ زید، عمرو، بکر کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کیا کرتے تھے۔ لیکن ہزاروں برس بعد جب قرآن نے انھیں قصوں کو قانون قدرت کے تاریخی تسلسل کی شہادت کی حیثیت سے پیش کیا تو کلام الٰہی بن گیا جس پر ایمان لانا واجب قرار پا گیا۔ اور جس کا انکار کرنا کفر ٹھہر گیا۔ بھلا ان قصوں کا کیوں کر اعتبار کیا جائے جو ہزار ہا برس تک قصہ گویوں اور داستان سراؤں کا موضوع سخن بنے رہے، ہر کہہ ومہ کی زبان پر بے روک ٹوک گشت کرتے رہے۔ اور جنھیں ان کے وقوع کے ہزار ہا برس بعد ایک نبوت کے دعویدار نے قید کتابت میں لا کر وحی الٰہی اور دین وایمان کا جزو قرار دے دیا۔

بتایئے! اگر آپ کے سامنے دشمن اسلام یہ سوال پیش کر دے تو آپ اپنے مذکورہ بالا اصول پر قائم رہتے ہوئے کیا جواب دے سکتے ہیں؟ اور اگر قرآن کی استنادی حیثیت ماننے اور منوانے کے سلسلے میں آپ اس اصول کے پابند نہیں تو حدیث کی استنادی حیثیت کے معاملے میں اس اصول کی پابندی پر آپ کو اصرار کیوں ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو محفوظ، مستند اور قابل اعتماد قرار دینے کے لئے اس کا قید کتابت میں لایا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یعنی یہ اصول اور معیار ہی سرے سے غلط ہے کہ اگر کوئی بات اپنے وقوع کے وقت قید کتابت میں آ گئی تو قابل اعتماد ہوگی ورنہ نہیں۔ اس لئے یہ خیال صحیح نہیں کہ قرآن اس لئے قابل اعتماد واستناد ہے کہ وہ لکھوا لیا گیا تھا۔ اور احادیث اس لئے قابل اعتماد واستناد نہیں کہ وہ عہد رسالت اور عہد خلافت میں لکھوائی نہیں گئی تھیں۔ بلکہ اس سلسلہ میں معاملہ کی جو صحیح نوعیت ہے اسے ذیل کے الفاظ میں سنئے:

”اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن کو جس وجہ سے لکھوایا گیا وہ یہ تھی کہ اس کے الفاظ اور معنی دونوں من جانب اللہ تھے، اس کے الفاظ کی ترتیب ہی نہیں، اس کی آیتوں کی ترتیب اور سورتوں کی ترتیب بھی اللہ کی طرف سے تھی۔ اس کے الفاظ کو دوسرے الفاظ سے بدلنا بھی جائز نہ تھا۔ اور وہ اس لئے نازل ہوا تھا کہ لوگ انہی الفاظ میں

اسی ترتیب کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اس کے بالمقابل سنت کی نوعیت بالکل مختلف تھی، وہ محض لفظی نہ تھی، بلکہ عملی بھی تھی۔ اور جو لفظی تھی اس کے الفاظ قرآن کے الفاظ کی طرح بذریعہ وحی نازل نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ حضور ﷺ نے اس کو اپنی زبان میں ادا کیا تھا۔ پھر اس کا ایک بڑا حصہ ایسا تھا جسے حضور ﷺ کے ہم عصروں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا۔ مثلاً یہ کہ حضور ﷺ کے اخلاق ایسے تھے، حضور ﷺ کی زندگی ایسی تھی۔ اور فلاں موقع پر حضور ﷺ نے یوں عمل کیا۔ حضور ﷺ کے اقوال اور تقریریں نقل کرنے کے بارے میں بھی یہ پابندی نہ تھی کہ سننے والے انھیں لفظ بلفظ نقل کریں۔ بلکہ اہل زبان سامعین کے لئے یہ جائز تھا اور وہ اس پر قادر بھی تھے کہ آپ سے ایک بات سن کر معنی و مفہوم بدلے بغیر اسے اپنے الفاظ میں بیان کر دیں۔ حضور ﷺ کے الفاظ کی تلاوت مقصود نہ تھی۔ بلکہ اس تعلیم کی پیروی مقصود تھی جو آپ نے دی ہو۔ احادیث میں قرآن کی آیتوں اور سورتوں کی طرح یہ ترتیب محفوظ کرنا بھی ضروری نہ تھا کہ فلاں حدیث پہلے ہو اور فلاں اس کے بعد۔ اس بناء پر احادیث کے معاملے میں یہ بالکل کافی تھا کہ لوگ اسے یاد رکھیں، اور دیانت کے ساتھ انھیں لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کے معاملے میں کتابت کی وہ اہمیت نہ تھی جو قرآن کے معاملے میں تھی۔

دوسری بات جسے خوب سمجھ لینا چاہئے۔ یہ ہے کہ کسی چیز کے سند اور حجت ہونے کے لئے اس کا لکھا ہوا ہونا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ اعتماد کی اصل بنیاد اس شخص یا ان اشخاص کا بھروسے کے قابل ہونا ہے جس کے یا جن کے ذریعہ سے کوئی بات دوسرے تک پہنچے، خواہ وہ مکتوب ہو یا غیر مکتوب۔ خود قرآن کو اللہ تعالیٰ نے آسمان سے لکھوا کر نہیں بھیجا۔ بلکہ نبی ﷺ کی زبان سے اس کو بندوں تک پہنچایا۔ اللہ نے پورا انحصار اس بات پر کیا کہ جو لوگ نبی ﷺ کو سچا مانیں گے وہ نبی ﷺ کے اعتماد پر قرآن کو ہمارا کلام مان لیں گے۔ نبی ﷺ نے بھی قرآن کی جتنی تبلیغ و اشاعت کی زبانی ہی کی۔ آپ کے جو صحابہ مختلف علاقوں میں

جا کر تبلیغ کرتے تھے وہ قرآن کی سورتیں لکھی ہوئی نہ لے جاتے تھے۔ لکھی ہوئی آیات اور سورتیں تو اس تھیلے میں پڑی رہتی تھیں جس کے اندر آپ انھیں کاتبان وحی سے لکھوا کر ڈال دیا کرتے تھے۔ باقی ساری تبلیغ واشاعت زبان سے ہوتی تھی۔ اور ایمان لانے والے اس ایک صحابی کے اعتماد پر یہ بات تسلیم کرتے تھے کہ جو کچھ وہ سنا رہا ہے وہ اللہ کا کلام ہے۔ یا رسول علیہ ﷺ کا جو حکم وہ پہنچا رہا ہے وہ حضور ﷺ ہی کا حکم ہے۔

تیسرا اہم نکتہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ لکھی ہوئی چیز بجائے خود کبھی قابل اعتماد نہیں ہوتی جب تک کہ زندہ اور قابل اعتماد انسانوں کی شہادت اس کی توثیق نہ کرے۔ محض لکھی ہوئی کوئی چیز اگر ہمیں ملے اور ہم اصل لکھنے والے کا خط نہ پہچانتے ہوں یا لکھنے والا خود نہ بتائے کہ یہ اسی کی تحریر ہے، یا ایسے شاہد موجود نہ ہوں جو اس امر کی تصدیق کریں کہ یہ تحریر اسی کی ہے جس کی طرف منسوب کی گئی ہے تو ہمارے لئے محض وہ تحریر یقینی کیا معنی، ظنی حجت بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے جسے موجودہ زمانے کا قانون شہادت بھی تسلیم کرتا ہے۔ اور فاضل جج خود اپنی عدالت میں اس پر عمل فرماتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے محفوظ ہونے پر ہم جو یقین رکھتے ہیں کیا اس کی بنیاد یہی ہے کہ وہ لکھا گیا تھا۔ کاتبین وحی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے صحیفے جو حضور ﷺ نے املا کرائے تھے آج دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ اگر موجود ہوتے تو بھی آج کون یہ تصدیق کرتا کہ یہ وہی صحیفے ہیں جو حضور ﷺ نے لکھوائے تھے۔ خود یہ بات بھی کہ حضور ﷺ اس قرآن کو نزول وحی کے ساتھ ہی لکھوالیا کرتے تھے، زبانی روایات ہی سے معلوم ہوئی ہے۔ ورنہ اسکے جاننے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا۔ پس قرآن کے محفوظ ہونے پر ہمارے یقین کی اصل وجہ اس کا لکھا ہوا ہونا نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ زندہ انسان زندہ انسانوں سے مسلسل اس کو سنتے اور آگے زندہ انسانوں تک اسے پہنچاتے چلے آرہے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال ذہن سے نکال دینا چاہئے کہ کسی چیز کے محفوظ ہونے کی واحد سبیل اس کا لکھا ہوا ہونا ہے۔

ان امور پر اگر فاضل جج اور ان کی طرح سوچنے والے حضرات غور فرمائیں۔ تو انھیں یہ تسلیم کرنے میں ان شاء اللہ کوئی زحمت پیش نہ آئے گی کہ اگر معتبر ذرائع سے کوئی چیز پہنچے تو وہ سند بننے کی پوری قابلیت رکھتی ہے خواہ وہ لکھی نہ گئی ہو۔

تمام منکرین حدیث بار بار قرآن کے لکھے جانے اور حدیث کے نہ لکھے جانے پر اپنے دلائل کا دارومدار رکھتے ہیں۔ لیکن یہ بات کہ حضور ﷺ اپنے زمانے میں کاتبان وحی سے نازل شدہ وحی لکھوا لیتے تھے۔ اور اس تحریر سے نقل کر کے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرآن کو مصحف کی شکل میں لکھا گیا۔ اور بعد میں اسی کی نقلیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے شائع کیں یہ سب کچھ محض حدیث کی روایات ہی سے دنیا کو معلوم ہوا ہے۔ قرآن میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ نہ حدیث کی روایات کے سوا اس کی کوئی دوسری شہادت دنیا میں کہیں موجود ہے۔ اب اگر حدیث کی روایات سرے سے قابل اعتماد ہی نہیں تو پھر کس دلیل سے دنیا کو آپ یقین دلائیں گے کہ فی الواقع قرآن حضور ﷺ کے زمانے میں لکھا گیا تھا؟

کسی کا یہ کہنا کہ عہد نبوی کے رواجات، روایات، نظائر، فیصلوں، احکام اور ہدایات کا پورا ریکارڈ ہم کو "ایک کتاب" کی شکل میں مرتب شدہ ملنا چاہیئے تھا در حقیقت ایک خالص غیر عملی طرز فکر ہے۔ اور وہی شخص یہ بات کہہ سکتا ہے جو خیالی دنیا میں رہتا ہو۔ آپ قدیم زمانے کے عرب کی حالت چھوڑ کر تھوڑی دیر کیلئے آج اس زمانے کی حالت کو لے لیجئے جب کہ احوال و وقائع کو ریکارڈ کرنے کیلئے ذرائع بے حد ترقی کر چکے۔ فرض کر لیجئے کہ اس زمانے میں کوئی لیڈر ایسا موجود ہے جو ۲۳ سال تک شب و روز کی مصروف زندگی میں ایک عظیم الشان تحریک برپا کرتا ہے۔ ہزاروں افراد کو اپنی تعلیم و تربیت سے تیار کرتا ہے۔ ان سے کام لے کر ایک پورے ملک کی فطری، اخلاقی، تمدنی اور معاشی زندگی میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اپنی قیادت و رہنمائی میں ایک نیا معاشرہ اور ایک نئی ریاست وجود میں لاتا ہے۔ اس معاشرے میں اس کی ذات ہر وقت ایک مستقل نمونہ ہدایت بنی رہتی ہے۔ ہر حالت میں لوگ اسکو دیکھ

دیکھ کر یہ سبق لیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے۔ ہر طرح کے لوگ شب و روز اس سے ملتے رہتے ہیں۔ اور وہ ان کو عقائد و افکار، سیرت و اخلاق، عبادات و معالات غرض ہر شعبہ زندگی کے متعلق اصولی ہدایات بھی دیتا ہے اور جزئی احکام بھی۔ پھر اپنی قائم کردہ ریاست کا فرمانروا، قاضی، شارع، مدبر اور سپہ سالار بھی تنہا وہی ہے۔ اور دس سال تک اس مملکت کے تمام شعبوں کو وہ خود اپنے اصولوں پر قائم کرتا اور اپنی رہنمائی میں چلاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج اس زمانے میں یہ سارا کام کسی ایک ملک میں ہو تو اسکا ریکارڈ ''ایک کتاب'' کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے؟ کیا ہر وقت اس لیڈر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لگا رہ سکتا ہے؟ کیا ہر آن فلم کی مشین (ویڈیو کیمرہ) اس کی شبانہ روز نقل و حرکت ثبت کرنے میں لگی رہ سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ ٹھپا جو اس لیڈر نے ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی پر، پورے معاشرے کی ہیئت اور پوری ریاست کے نظام پر چھوڑا ہے سرے سے کوئی شہادت ہی نہیں ہے جس کا اعتبار کیا جا سکے؟ کیا آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ اس لیڈر کی تقریر سننے والے، اس کی زندگی دیکھنے والے، اس سے ربط و تعلق رکھنے والے بے شمار افراد کی رپورٹیں سب کی سب ناقابل اعتماد ہیں۔ کیونکہ خود اس لیڈر کے سامنے وہ ''ایک کتاب'' کی شکل میں مرتب نہیں کی گئیں اور لیڈر نے ان پر اپنے ہاتھ سے مہر تصدیق ثبت نہیں کی؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ اس کے عدالتی فیصلے اور اس کے انتظامی احکام، اس کے قانونی فرامین، اس کے صلح و جنگ کے معاملات کے متعلق جتنا مواد بھی بہت سی مختلف صورتوں میں موجود ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک ''جامع و مانع کتاب'' کی شکل میں تو ہے ہی نہیں؟ (ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر ص ۳۳، ۳۴، ۱۶۳، ۳۳۶، ۳۳۸)۔

اس وضاحت کے بعد یہ بھی عرض ہے کہ آپ ذخیرۂ حدیث کو فن تاریخ کے معیار پر پورا اترتا ہوا تسلیم نہیں کرتے، اس لئے آپ کو چیلنج ہے کہ آپ دنیا کے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تاریخ کو معیار حدیث کے ہم پلہ ہی ثابت کر دیجئے، صرف بڑا بول بول دینا کوئی کمال نہیں۔

دیکھ کر یہ سبق لیتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے ۔ ہر طرح کے لوگ شب و روز اس سے ملتے رہتے ہیں۔ اور وہ ان کو عقائد و افکار، سیرت و اخلاق، عبادات و معالات غرض ہر شعبہ زندگی کے متعلق اصولی ہدایات بھی دیتا ہے اور جزئی احکام بھی ۔ پھر اپنی قائم کردہ ریاست کا فرمانروا، قاضی، شارع، مدبر اور سپہ سالار بھی تنہا وہی ہے۔ اور دس سال تک اس مملکت کے تمام شعبوں کو وہ خود اپنے اصولوں پر قائم کرتا اور اپنی رہنمائی میں چلاتا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج اس زمانے میں یہ سارا کام کسی ایک ملک میں ہو تو اسکا ریکارڈ ''ایک کتاب'' کی شکل میں مرتب ہو سکتا ہے؟ کیا ہر وقت اس لیڈر کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر لگا رہ سکتا ہے؟ کیا ہر آن فلم کی مشین (ویڈیو کیمرہ) اس کی شبانہ روز نقل و حرکت ثبت کرنے میں لگی رہ سکتی ہے؟ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ ٹھپا جو اس لیڈر نے ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگی پر، پورے معاشرے کی ہیئت اور پوری ریاست کے نظام پر چھوڑا ہے سرے سے کوئی شہادت ہی نہیں ہے جس کا اعتبار کیا جا سکے؟ کیا آپ یہ دعویٰ کریں گے کہ اس لیڈر کی تقریر سننے والے، اس کی زندگی دیکھنے والے، اس سے ربط و تعلق رکھنے والے بے شمار افراد کی رپورٹیں سب کی سب ناقابل اعتماد ہیں۔ کیونکہ خود اس لیڈر کے سامنے وہ ''ایک کتاب'' کی شکل میں مرتب نہیں کی گئیں اور لیڈر نے ان پر اپنے ہاتھ سے مہر تصدیق ثبت نہیں کی؟ کیا آپ فرمائیں گے کہ اس کے عدالتی فیصلے اور اس کے انتظامی احکام، اس کے قانونی فرامین، اس کے صلح و جنگ کے معاملات کے متعلق جتنا مواد بھی بہت سی مختلف صورتوں میں موجود ہے اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک ''جامع و مانع کتاب'' کی شکل میں تو ہے ہی نہیں؟ (ترجمان القرآن منصب رسالت نمبر ص ۳۳، ۳۴، ۱۶۳، ۳۳۶ ـ ۳۳۸)۔

اس وضاحت کے بعد یہ بھی عرض ہے کہ آپ ذخیرۂ حدیث کو فن تاریخ کے معیار پر پورا اترتا ہوا تسلیم نہیں کرتے، اس لئے آپ کو چیلنج ہے کہ آپ دنیا کے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ معیار تاریخ کو معیار حدیث کے ہم پلہ ہی ثابت کر دیجئے، صرف بڑا بول بول دینا کوئی کمال نہیں۔

الزام تراشی اور فحش نگاری کے الزام کی حقیقت:

آپ نے منکرین حدیث کا انداز ادعاء بلکہ انداز افتراء اختیار کرتے ہوئے حدیث کے ایک اور ''تاریک پہلو'' کی نشاندہی کی ہے۔ جسے آپ کے بقول ''اسلامی تاریخ'' کا ''المیہ'' کہنا چاہیے کہ حدیث کے مجموعوں میں ایسی روایات بکثرت ملتی ہیں جو الزام تراشی، دروغ بافی اور فحش نگاری کا مرقع ہیں۔

اور اس ''بکثرت'' کی مقدار خود آپ لوگوں کی نشاندہی کے مطابق ایک فیصدی بھی نہیں۔ کیا اسی کو ''بکثرت'' کہا جاتا ہے؟ پھر جہاں تک ''دروغ بافی'' کا سوال ہے تو حقیقت کھل چکی ہے۔ جب تک آپ یہودی مستشرقین کی خردبین لگا کر دیکھیں گے یرقان کے مریض کی طرح آپ کو ہر طرف دروغ ہی دروغ نظر آئے گا۔ کیونکہ یہ مرض آپ کے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کا واحد علاج یہ ہے کہ آپ حقیقت پسندی اختیار کریں۔ اور معاملہ کو اس کی صحیح اور اصل شکل میں ملاحظہ فرمائیں۔ ورنہ جب تک آپ گھر کے مالک اور محافظ کو چور اور پولیس پارٹی کو ڈاکو سمجھیں گے آپ کو اس بیماری سے نجات نہیں مل سکتی۔

باقی رہا ''الزام تراشی'' اور ''فحش نگاری'' کا دعویٰ تو یہ بھی سراسر زبردستی ہی ہے۔ آپ کے اشارے یا تو ان روایات کی طرف ہیں جن کے جھوٹ ہونے کی قلعی خود محدثین نے کھول دی ہے۔ لیکن آپ کمال ڈھٹائی سے ان چوری پکڑنے والوں ہی کو چور کہہ رہے ہیں۔ یا پھر آپ نے ایسی باتوں کو ''الزام تراشی'' اور ''فحش نگاری'' قرار دیدیا ہے جن کی نظیریں خود قرآن میں موجود ہیں۔ تو کیا (نعوذ باللہ) آپ قرآن میں ''الزام تراشی'' اور ''فحش نگاری'' تسلیم کریں گے؟ اگر نہیں تو پھر حدیث اور روایات کی ویسی ہی باتوں کو آپ ''الزام تراشی'' اور ''فحش نگاری'' قرار دینے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں؟ آپ نے جن روایات

کی طرف اشارہ کیا ہے آیئے انھیں میں سے ایک آدھ سے اس کی توضیح کردوں۔

آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام لیا ہے۔ ان کی بابت صحیح بخاری (۱) میں مذکور ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں تین کذبات کا ارتکاب کیا ہے۔ کذب، جھوٹ، غلط اور خلاف واقعہ بات کو کہتے ہیں۔ صحیح بخاری کی یہ روایت سنتے ہی آپ حضرات بھی اور قائلین حدیث میں سے بعض عقلیت پسند بھی سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ لیکن آیئے ذرا سنجیدگی سے اس روایت پر غور کریں۔

اس روایت میں جن تین کذبات کا انتساب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کیا گیا ہے ان میں سے دو کی تفصیلات خود قرآن میں مذکور ہیں۔ قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم سے باتیں کر رہے تھے، اچانک انھوں نے تاروں پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ میں بیمار ہوں۔ قوم چلی گئی اور حضرت ابراہیم نے جھٹ اٹھ کر ان کے بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا۔ قوم نے واپس آ کر معاملے کی تفتیش کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ تمہاری حرکت ہے؟ انھوں نے کہا، بلکہ اس بڑے بت نے یہ حرکت کی ہے اگر تمہارے یہ معبود بولتے ہیں۔ تو ان سے پوچھ لو، الخ۔

اس میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیماری کا عذر جس سیاق وسباق میں کیا تھا اس کا منشاء یا تو یہ تھا کہ میں تمہارے ساتھ چلنے کے لائق نہیں۔ یا یہ کہ بیماری کے سبب میرے لئے بات چیت کرنی مشکل ہے۔ لیکن جوں ہی قوم ہٹی، وہ جھٹ اٹھے۔ اور بتوں پر پل پڑے۔ اگر واقعۃً وہ ایسے ہی بیمار تھے جیسی بیماری کا اظہار فرمایا تھا تو کیا وہ بت خانے تک پہنچ سکتے تھے؟ اور بتوں کو توڑ سکتے تھے؟

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ (واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا) حدیث۔ ۳۳۵۸)
صحیح مسلم۔ کتاب الفضائل، باب من فضائل ابراہیم الخلیل علیہ السلام (حدیث۔ ۲۳۷۱)

(۲) دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے بت شکنی کا الزام بڑے بت پر عائد کیا۔ کیا واقعۃً اسی نے باقی بتوں کو توڑا تھا؟ یقیناً نہیں، ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دونوں باتیں خلاف واقعہ کہی تھیں، جسے عربی زبان میں کذب کہتے ہیں۔

تیسرے واقعہ کی تفصیل صحیح بخاری میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی بیوی سارہ کے ہمراہ ایک جابر حکمراں کے علاقے سے گذرے، وہ حکمراں خوبصورت عورتیں چھین لیتا تھا۔ اگر ساتھ میں شوہر ہوتا تو قتل کر دیا جاتا تھا۔ حضرت سارہ کو بھی اس حکمراں نے طلب کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ تم مجھے اپنا بھائی ظاہر کرنا۔ متعدد ماخذ میں اس کی وضاحت بھی ہے کہ حضرت سارہ کچھ دور کے تعلق سے حضرت ابراہیم علیہ اسلام کی بہن ہوتی تھیں۔ یوں بھی وہ دینی بہن تھیں۔ لیکن جس سیاق میں وہ اپنے آپ کو بہن کہتیں اس سے سننے والا یہ سمجھتا کہ حقیقی بہن ہیں۔ اس لئے یہ بات خلاف واقعہ ہوئی۔

یہ تینوں معاملے ایک اور پہلو سے بھی قابل غور ہیں۔ پہلے اور دوسرے موقع پر خلاف واقعہ بولے بغیر بھی مقصد حاصل ہوسکتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہہ سکتے تھے کہ آج مجھے معاف رکھیں، میں آپ حضرات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح وہ بڑے بت کا نام لئے بغیر کہہ سکتے تھے کہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ اپنے ان معبودوں سے پوچھ لو اگر بولتے ہوں۔ لیکن تیسرا موقع بڑا نازک تھا۔ بیوی اور جان دونوں خطرے میں تھے۔ ایسی صورت میں قرآن نے ارتکاب کفر تک کی اجازت دی ہے۔ ﴿اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ﴾ اس لئے یہ تیسرا واقعہ بھی قرآن کی نگاہ میں معیوب نہیں۔

یہ ہے ان تین کذبات کا خلاصہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب ہیں۔ ان میں سے پہلے دو کی نسبت خود قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کی ہے۔ صحیح بخاری میں ان کا صرف حوالہ دیا گیا ہے۔ البتہ تیسرا واقعہ صرف صحیح بخاری میں ہے۔ اب ظاہر

ہے کہ آپ اس نسبت کو ''الزام تراشی'' اور ''دروغ بافی'' کا مرقع قرار دے رہے ہیں تو آپ کے اس الزام کا صرف ۲/۳ حصہ قرآن پر عائد ہوتا ہے جس کے جواز کا فتویٰ دینے میں خود قرآن بھی شریک ہے اور اس الزام کا باقی ۱/۳ حصہ صحیح بخاری پر عائد ہوتا ہے۔ غور فرمائیے کہ آپ نے کس جسارت اور دلیری کے ساتھ حدیث دشمنی کے جوش میں قرآن مجید ہی کو ''الزام تراشی'' اور دروغ بافی'' کا مرقع قرار دے دیا۔ **فَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا**

آپ نے حضرت یوسف علیہ السلام کا نام بھی لیا ہے۔ حالانکہ صحیح احادیث میں تو ان پر کوئی الزام نہیں۔ بلکہ انھیں کریم ابن کریم ابن کریم ابن کریم کہا گیا ہے۔ اور قید خانے میں ان کی ثابت کی قدمی پر ان کی مدح و توصیف کی گئی ہے (۱)۔ البتہ قرآن میں یہ بتلایا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے حقیقی بھائی سے ساز باز کر کے ان کے غلے میں شاہی برتن رکھ دیا۔ پھر اپنے بھائیوں کے قافلے پر چوری کا الزام عائد کرا کے ان کی تلاشی لی۔ اور حقیقت چھپانے کیلئے پہلے دوسرے بھائیوں کی تلاشی لی۔ پھر اپنے حقیقی بھائی کے برتن سے غلہ نکال کر دوسرے بھائیوں سے لئے گئے اقرار کے مطابق اپنے حقیقی بھائی کو اپنے پاس روک لیا۔

غالباً آپ کے ذہن میں یہی واقعہ تھا۔ لیکن آپ کو یہ یاد نہیں رہا کہ اس کا ذکر قرآن میں ہے۔ اس لئے آپ نے اسے شان انبیاء کے خلاف سمجھ کر احادیث اور روایتوں پر ''الزام تراشی'' کا الزام تراشنے میں اپنی چابکدستی کا مظاہرہ فرما دیا۔ لیکن آپ کی اس چابکدستی کی زد حدیث کے بجائے قرآن پر آپڑی۔

قریب قریب یہی معاملہ ان بقیہ شخصیتوں کا ہے جن کے اسماء گرامی آپ نے ذکر کئے ہیں۔ اگر تفصیل میں آپ جانا چاہتے ہیں تو چلئے ہم بھی تیار ہیں۔

---

(۱) صحیح بخاری، کتاب احادیث الانبیاء: باب (ام کنتم شھداء اذ حضر یعقوب الموت) (حدیث۔ ۳۳۸۲۔۳۳۸۷)۔ صحیح مسلم، کتاب الایمان: باب زیادۃ طمانیۃ القلب بتظاھر الادلۃ (حدیث۔۱۵۱)

سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں

کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

ہماری اس توضیح سے یہ حقیقت بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ آیا امام بخاری رحمہ اللہ کا نام سن کر جماعت اہلحدیث پر ''سہم کا دورہ'' پڑ جاتا ہے، یا آپ حضرات پر جوش مخالفت میں سرسامی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد آپ حضرات کو ہوش ہی نہیں رہتا کہ آپ کیا بک رہے ہیں۔ اور کس کے خلاف بک رہے ہیں۔

آپ نے حدیث پر " **مثلہ معہ** "کی پھبتی بھی چست فرمائی ہے۔ مگر بتایئے کہ جب قرآن مجید نے اسوۂ رسول کو مدار نجات قرار دے کر اپنے بنیادی احکام تک کی تفصیلات اسی پر چھوڑ دی ہیں۔ اور اس اسوہ کو اس حد تک وسعت دی ہے کہ پیغمبروں کے خواب تک کو وحی الٰہی اور حکم الٰہی کا درجہ دے رکھا ہے۔ اور جگہ بہ جگہ ایسی وحی کے حوالے دیئے ہیں جن کا قرآن میں کہیں نام ونشان تک نہیں تو خود اس قرآن کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا؟ حدیث سے پہلے آپ کی اس پھبتی کی زد تو خود قرآن ہی پر پڑ رہی ہے۔ اگر آپ اسے ماننے کیلئے تیار نہیں تو آئندہ اس اجمال کی تفصیل بھی پیش کر سکتا ہوں۔

ان گنت راویوں پر ایمان لانے کا معاملہ:

آپ نے یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ قرآن پر ایمان لانے کے لئے رسول کی رسالت پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پس اسی طرح روایتوں کو حدیث رسول ماننے کے لئے تمام راویوں پر ایمان لانا ضروری ہوگا۔ تو کیا ہمیں اللہ اور رسول کی طرف سے ان گنت راویوں پر ایمان لانے کی تکلیف دی گئی ہے؟

اولاً: میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ نے حضور ﷺ کو خود دیکھا ہے؟ اور حضور ﷺ پر قرآن کے نزول کا بذات خود مشاہدہ کیا ہے؟ نہیں۔ بلکہ آپ تو چودھویں صدی

میں پیدا ہوئے ہیں۔ اب آپ بتایئے کہ آپ کو اس بات کا علم کیسے ہوا کہ حضور ﷺ پیغمبر تھے؟ اور آپ پر یہی قرآن نازل ہوا تھا جو اس وقت ہمارے ہاں متداول ہے؟ آپ یہی کہیں گے کہ اس امت کے اجتماعی نقل و تواتر سے یہ قرآن ہم تک پہنچا ہے اس لئے ہم اس کی صحت کا یقین رکھتے ہیں۔

اب مجھے عرض کرنے دیجئے کہ آپ کے مقرر کئے ہوئے اصول کے مطابق قرآن پر ایمان لانے کے لئے صرف حضور ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا کارآمد نہ ہو سکے گا۔ بلکہ اس چودہ سو برس کے دوران پیدا ہونے والے تمام مسلمان مردوں اور عورتوں پر (خواہ وہ زاہد و متقی ہوں خواہ فاسق و فاجر) ایمان لانا ہوگا، تو کیا ہمیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اس امت کے اِن اَن گنت نیک و بد انسانوں پر ایمان لانے کی تکلیف دی گئی ہے؟ انا للہ!

آئینہ دیکھئے گا ذرا دیکھ بھال کر
مشکل بہت پڑے گی برابر کی چوٹ ہے

ثانیاً: قرآن نے جو یہ حکم دیا ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی خبر دے تو قرآن کے اس اصول اور حکم پر عمل کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ اگر قرآن کے اس حکم پر عمل کیا گیا اور اس کی بتائی ہوئی خبر قابل قبول ثابت ہوئی تو کیا اس خبر کو ماننے کے لئے اس شخص پر ایمان لانا پڑے گا؟ اگر ایمان لانا پڑے گا تو پھر ایسے جتنے بھی افراد پر ایمان لانا پڑے لایئے، یہ تو عین حکم قرآنی کا اتباع ہوگا۔ اور اگر نہیں لانا پڑے گا تو پھر آپ کی اس چیخ و پکار کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے کہ روایتوں کو قبول کرنے کا مطالبہ کر کے درحقیقت ہم سے ان گنت راویوں پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے؟

اللہ کے بندے اپنے ''تفقہ فی الدین'' اور ''تدبر فی القرآن'' کی کچھ تو لاج رکھنی تھی۔ ہماری پچھلی گذارشات سے واضح ہو چکا ہے کہ آپ جس چیز کو ایک ''ٹھوس حقیقت''

سمجھے بیٹھے ہیں وہ درحقیقت ایک پھسپھسا تخیل ہے جس کی حیثیت ﴿ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴾ سے زیادہ نہیں ہے۔

اگر کوئی ٹھوس حقیقت ہے تو صرف یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اور اس کی کتاب پر ایمان لانا فرض ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر ایمان لانا، آپ کی اطاعت کرنا، آپ کے فیصلہ کو دل کی تنگی و ناگواری کے بغیر تسلیم کرنا، اور ان فیصلوں کے مقابل میں اپنے آپ کو خود مختار نہ سمجھنا، آپ کے اسوہ اور طریق عمل کی پیروی کو رضائے الٰہی اور نجات آخرت کا مدار سمجھنا اور آپ کے اوامر و نواہی کی پابندی کرنا فرض ہے، یہ سارا فرض خود قرآن نے عائد کیا ہے، اس فرض کو عائد کرنے کے بعد اس نے دین کے بڑے اہم اور بنیادی قسم کے مسائل میں خاموشی اختیار کر لی ہے۔ نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم سینکڑوں جگہ دیا ہے۔ مگر ان کی تفصیلات سے خاموش ہے۔ اسی طرح اس نے زندگی کے بے شمار مسائل میں صرف بعض بنیادی امور کی طرف اشارہ کر کے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ کیونکہ اس نے باقی تفصیلات کا دارومدار اسوۂ رسول پر رکھ دیا ہے۔

اب جو لوگ یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ قرآن سے باہر اسوۂ رسول کہیں بھی محفوظ نہیں رہ گیا ہے، اور احادیث کے نام سے جو ذخائر امت کے ہاتھ میں متداول ہیں ان کی کوئی حیثیت اور کوئی مقام نہیں، وہ درحقیقت قرآن کو ناقابل عمل اور اس کی رہنمائی کو سراپا لغو سمجھ رہے ہیں۔ اور انکار حدیث کا لبادہ اوڑھ کر قرآنی تعلیمات کو روندنے اور کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو عاجز و درماندہ اور مجبور و بے بس سمجھ رہے ہیں کہ اس نے اسوۂ رسول کی پیروی کا حکم تو دے دیا، اور اسے مدار نجات تو ٹھہرا دیا، لیکن چند ہی برس بعد جب چند "ایرانی سازشیوں" نے اس اسوۂ رسول کے خلاف "سازش" کی تو اپنی تمام تر قوت

وطاقت، ملک و جبروت اور حکمت وقہرمانی کے باوجود ان کی ''سازش'' کو ناکام نہ بنا سکا، امت مرحومہ کی دستگیری نہ کرسکا۔ اور ہمیشہ کے لئے گمراہی میں بھٹکتا ہوا چھوڑ دیا۔

وہ لوگ اپنے یہودی مستشرقین کی پلائی ہوئی شراب ''حقیقت پسندی'' کے نشے میں بدمست ہو کر ساری امت کو بیوقوف سمجھ بیٹھے ہیں۔ اور رسول اللہ ﷺ کی بتائی ہوئی شاہراہ ہدایت سے کٹ کر اور لوگوں کو کاٹ کر اپنی عقلی تک بندیوں کے خارزار پر دوڑنا چاہتے ہیں جو سراسر بے انصافی اور انتہائی زیادتی ہے اور جس کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے۔

﴿وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَ تْ مَصِيْرًا﴾

یعنی جو شخص ہدایت واضح ہو جانے کے بعد رسول کی مخالفت اختیار کرے گا، اور مومنین کی راہ سے الگ تھلگ اپنی راہ بنائے گا ہم اسے اسی راہ پر ڈالدیں گے جسے اس نے اختیار کیا ہے، اور اسے جہنم میں جلائیں گے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے۔

اطاعت رسول ﷺ اور منصب رسالت:

رسالہ زیر کتابت تھا کہ مدھوپوری صاحب کا ایک نیا مکتوب وارد ہوا۔ جس میں رسول اور اطاعت رسول کا مطلب بیان کیا گیا تھا۔ ہم نے اس کا بھی فی الفور جواب دیدیا۔ جس کے بعد سے موصوف خاموش ہیں۔ مناسب معلوم ہوا کہ یہ بحث بھی رسالے میں شامل کر دی جائے۔ مدھوپوری صاحب لکھتے ہیں:

سوال: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (یعنی اطاعت کرو اللہ کی۔ اور اطاعت کرو رسول کی) اللہ کی اطاعت سے قرآن مراد لیتے ہیں اور رسول کی اطاعت سے حدیث، یہ خیال صحیح ہے یا غلط؟

جواب: غلط! بالکل غلط! بلکہ قرآن میں صریح تحریف کے مترادف ہے۔ آیت زیر نظر

میں لفظ ''قرآن'' کا ذکر ہے نہ ''حدیث'' کا۔سوال دراصل ''اللہ ورسول'' کی اطاعت کا ہےاور ظاہر ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت سے مراد اللہ کے ان حکموں کی اطاعت ہے جو اس نے اپنے رسول کے ذریعہ لوگوں تک پہنچا دیئے، اور بس، نہ کہ دو مختلف الاصل کتابوں یا دو الگ الگ حاکموں کی جدا جدا مستقل بالذات اطاعت؟ یاللعجب! یہ ''دوئی'' کی ذہنیت تو (پناہ بخدا) توحید سے بہت دور لے جا کر پھینک دیتی ہے۔وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيْداً

جواب:

سب سے پہلے تو یہ عرض ہے کہ جب آیت زیر نظر میں لفظ قرآن کا ذکر ہے نہ حدیث کا تو پھر آپ کس بنیاد پر ایک کو یعنی قرآن کو مانتے اور دوسرے کا یعنی حدیث کا انکار کرتے ہیں؟ اگر اس آیت کے اندر کسی چیز کا ذکر کرنا ہی اس کے ماننے یا رد کرنے کی دلیل ہے تو پھر آپ یا تو دونوں کو مانیے یا دونوں کو رد کر دیجئے۔ اگر آپ کہیں کہ قرآن کو ماننے اور حدیث کو نہ ماننے کی وجہیں دوسری ہیں تو سوال یہ ہے کہ پھر آپ نے یہ بے موقع راگ کیوں چھیڑی دی؟ اس کے بعد اصل جواب سنئے!

تحریر بالا میں سوال کے اندر جو مفروضہ قائم کیا گیا ہے وہ بھی ہمارے خیالات ونظریات کی غلط ترجمانی ہے۔اور جواب کے اندر جس پہلو کو ملحوظ رکھ کر تیزی طبع کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہ بھی منکرین حدیث کا اپنا طبع نواد یعنی گھڑا ہوا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہم اللہ کی اطاعت کے لئے بھی قرآن وحدیث دونوں کو لازمی سمجھتے ہیں اور رسول ﷺ کی اطاعت کے لئے بھی قرآن وحدیث دونوں ہی کی پیروی ضروری ٹھہراتے ہیں۔ ہمارے یہاں سرے سے اس طرح کا ''بٹوارہ'' ہی نہیں ہے کہ اللہ کے احکام ومرضیات تو قرآن میں ہیں اور رسول کے احکام ومرضیات حدیث میں ہیں بلکہ قرآن وحدیث دونوں مشترک طور پر اللہ تعالیٰ کے

احکام ومرضیات کے ترجمان ہیں۔اوران دونوں کے ذریعہ مجموعی طور پر رسول اللہ ﷺ نے حق رسالت ادا کیا ہے،اور کارہائے نبوت انجام دیئے ہیں۔ان میں سے ایک یعنی قرآن اصل ہے۔اوردوسری یعنی حدیث اس کی توضیح وتبیین اورتشریح ہے۔جواللہ کے رسول ﷺ نے خود اللہ کے حکم، رہنمائی، مرضی اور منشاء کے مطابق انجام دی ہے۔ اسی لئے ذخیرۂ احادیث میں دین اسلام کے مسائل واحکام کی جوتفصیلات بیان کی گئی ہیں انھیں کوئی بھی مسلمان آنحضور ﷺ کی ''شخصی''اور''ذاتی'' رائے نہیں مانتا اور سمجھتا، بلکہ ہر مسلمان کا یہی عقیدہ ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے حسب منشا اپنے الفاظ میں لوگوں تک پہنچادیا ہے۔اوراللہ تعالیٰ نے ہی یہ کہہ کران کی اطاعت ضروری ٹھہرادی ہے کہ:

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوىٰ اِنْ هُوَاِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی

کہ آپ اپنی مرضی اورخواہش سے کچھ نہیں بولتے۔ بلکہ یہ محض (اللہ کی) وحی ہے جو آپ کی طرف کی جاتی ہے۔

ہماری اس توضیح سے یہ بات سمجھ میں آ چکی ہوگی کہ قرآن وحدیث دومختلف الاصل کتابیں نہیں ہیں۔ بلکہ دونوں ایک ہی اصل اور بنیاد پر قائم ہیں۔یہی حقیقت بھی ہے(جس کے دلائل کچھ گذرچکے ہیں کچھ آگے آرہے ہیں) اور یہی دنیا کے سارے مسلمانوں کا عقیدہ بھی ہے۔مدھوپوری ''محقق'' صاحب کا بیان اس سلسلے میں قطعی بے بنیاد ہے۔

اسی طرح دنیا کا کوئی مسلمان آنحضور ﷺ کی جداگانہ اور مستقل بالذات اطاعت کا قائل نہیں ہے۔ ہر مسلمان اسی حیثیت سے آپ کی اطاعت کا قائل ہے کہ آپ اللہ کے رسول تھے،اس کے احکام وفرامین اورمرضی وخوشنودی کی نمائندگی کرتے تھے۔آپ دین کے متعلق جوکچھ بھی بتلاتے تھے اللہ تعالیٰ کے حکم، ارشاد اور رہنمائی کی بناء پر بتلاتے تھے۔ چاہے یہ باتیں قرآن کے الفاظ میں بیان کی گئی ہوں یا حضور ﷺ کے اپنے الفاظ میں۔اس لئے آپ کی اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔جیسا کہ قرآن میں صاف صاف بتلا

دیا گیا۔

احادیث کے اندر متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں کہ آپ نے اپنی ذاتی رائے کی حیثیت سے بعض دفعہ بعض مشورے دیئے تو لوگوں نے اسے قبول کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ بلکہ آپ نے خود صاف صاف بتلا دیا کہ جب میں دینی کام کے متعلق حکم دوں تو بلا چوں چرا تسلیم کرلو، لیکن اپنی ذاتی اور بشری حیثیت میں کوئی مشورہ دوں تو تم لوگ اپنی صوابدید پر عمل کرنے کے لئے آزاد اور خودمختار ہو۔

خلاصہ یہ کہ دنیا کا کوئی مسلمان نہ تو دو ''مختلف الاصل'' کتابوں کو مانتا ہے اور نہ دو الگ الگ حاکموں کی جدا جدا مستقل بالذات اطاعت کا قائل ہے۔ حیرت ہے کہ مدھوپوری ''محقق'' صاحب مسلمانوں پر ایک ایسے عقیدے کا الزام تھوپ رہے ہیں جو خالص ان کا گھڑا ہوا اور محض ان کے دماغ کی پیداوار ہے۔ پھر اس گھڑے ہوئے ''عقیدہ'' کی تردید لکھ کر مست ہیں کہ انھوں نے قرآن کا ایک نکتہ سمجھ لیا ہے۔ کیا کہتے ہیں ان کی اس ''نکتہ رسی'' کے۔ بتایئے! کہ اصل ''نشانہ'' کو چھوڑ کر خلا میں تیراندازی کرنا کیا ان کے دماغی توازن کے صحیح ہونے کی علامت ہے؟

اطاعت رسول کا مطلب اور تقاضا:

اس کے بعد محترم نے چند آیات کی روشنی میں یہ بات ''ثابت کی'' کہ رسول کی اطاعت بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہے۔ بلکہ دراصل رسول ﷺ کی اطاعت میں خود اللہ کی اطاعت مضمر ہے۔

ہم کہتے ہیں بجا فرمایا۔ سوال یہ ہے کہ پھر آپ رسول ﷺ کی اطاعت سے بھاگتے کیوں پھر رہے ہیں؟ اور اس ذخیرۂ حدیث پر عمل کیوں نہیں کرتے جس کا انتساب خود قرآن کے مقرر کردہ ضابطے اور معیار کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی طرف صحیح ہے؟ جسے رسول

اللہ ﷺ نے اپنی ذاتی اور شخصی حیثیت سے نہیں بلکہ پیغمبرانہ حیثیت سے بیان فرمایا ہے۔ اور جسے قبول کئے بغیر خود قرآن کے احکام وفرامین اور تقاضے اور مطالبے کی تکمیل ممکن نہیں؟

جن آیات سے آپ نے مندرجہ بالا نتیجہ نکالا ہے آیئے ان آیات پر ذرا گہری نظر ڈالتے ہوئے ان کے اصل منشاء اور مقصد کو بھی سمجھتے چلیں۔ آیات یہ ہیں:

(۱) ﴿ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ﴾

یعنی جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔

(۲) ﴿ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ﴾

ہم نے کوئی بھی رسول نہیں بھیجا مگر اسی لئے کہ اللہ کے حکم سے اسکی اطاعت کی جائے۔

(۳) ﴿ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعاً مِّنَ الرُّسُلِ وَمَا اَدْرِىْ مَا يُفْعَلُ بِىْ وَلَا بِكُمْ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَىَّ وَمَا اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴾

آپ کہہ دیجئے کہ میں کوئی نیا رسول نہیں ہوں۔ اور نہیں جانتا کہ میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں محض اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جس کی وحی میری طرف کی جاتی ہے۔ اور میں انجام کے خطرے سے کھلا ہوا آگاہ کرنے والا ہوں۔

(۴) ﴿ يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ، وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ﴾

اے رسول! آپ کے پاس آپ کے رب کی طرف سے جو کچھ اتارا گیا ہے اسے لوگوں تک پہنچا دیجئے۔ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو آپ نے اس کی پیغام رسائی نہ کی۔ (ان آیات کے ساتھ ایک آیت اور بھی شامل کر لیجئے)

(۵) ﴿ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى ﴾

آپ اپنی خواہشات سے کوئی بات نہیں بولتے۔ یہ خالص وحی ہے جو آپ کی طرف

کی جاتی ہے۔

ان آیات سے تین باتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔

(الف) ایک یہ کہ حضور ﷺ خود اپنی خواہش نفس، اپنی ذاتی رائے اور اپنی صوابدید سے دین کی کوئی بات نہیں کہتے تھے، دین کی ہر بات آپ کو اللہ کی طرف سے بتائی، سمجھائی اور بجھائی جاتی تھی۔

(ب) دوسرے یہ کہ جو کچھ آپ ﷺ کو اللہ کی طرف سے دیا گیا آپ نے بلاکم وکاست لوگوں تک اس کو پہنچا دیا۔ نہ آپ نے اس میں کوئی کمی کی نہ زیادتی۔ ان دونوں باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ نے جو کچھ کہا، جو کچھ کیا اور جو کچھ اپنے صحابہ کو کہتے ہوئے سن کر یا کرتے ہوئے دیکھ کر برقرار رہنے دیا، اور اس میں کوئی تبدیلی اور اصلاح نہیں کی وہ سب اللہ کا حکم ہے اسکی رہنمائی ہے، اس کی وحی اور اس کا دین ہے۔

(ج) تیسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ دین کے تمام معاملات میں حضور ﷺ کی پیروی اور اطاعت فرض ہے۔ اس لئے آپ کی یہ اطاعت درحقیقت اللہ کی اطاعت ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے جو کچھ کہا اور کیا وہ سب قرآن کے اندر ہی ہے یا باہر بھی ہے؟ جواب یقیناً یہی ہوگا کہ سب کچھ قرآن کے اندر نہیں ہے اس لئے آپ کے جن اقوال وافعال کی تفصیلات قرآن سے باہر ہیں جب تک چھان پھٹک کر انھیں بھی نہ لے لیا جائے اس وقت تک خود قرآن کی ان آیات پر بھی عمل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً قرآن نے حکم دیا نماز پڑھو! مگر ترکیب نہیں بتائی۔ حکم دیا زکوۃ ادا کرو مگر تفصیل نہیں بتائی۔ یہ بتا دیا کہ رسول پاکیزہ چیزوں کو حلال اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہرانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ مگر پاکیزہ اور خبیث کی نشاندہی نہیں کی، حکم دیا کہ چور کے ہاتھ کو کاٹ لو، مگر دائیں یا بائیں ہاتھ کی، اور کاٹنے کی جگہ کی نشاندہی نہیں کی۔ حکم دیا حج، عمرہ کرو، مگر ان دونوں کے بہت سے ارکان نہیں بتائے۔ حکم دیا جمعہ کی اذان سن کر دوڑو مگر اذان اور نماز جمعہ وغیرہ کی تفصیل نہیں بتائی۔

ہر مسلمان کا ایمان ہے کہ حضور ﷺ نے ان تمام احکامات کی تعمیل کی۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ آپ نے ان احکامات کی تعمیل کے لئے کوئی خاص طریقہ اختیار کیا ہوگا۔ یعنی کسی خاص طریقۂ کار سے نماز پڑھی ہوگی۔ کسی خاص حساب سے زکوٰۃ دی اور دلائی ہوگی۔ پاکیزہ اور خبیث کی تفصیل بیان کی ہوگی۔ چور کے دونوں ہاتھ یا کوئی ایک ہاتھ کسی خاص جگہ سے کاٹا ہوگا۔ حج اور عمرہ کچھ خاص اوصاف کے ساتھ ادا کئے ہوں گے۔ چونکہ قرآن کی رو سے حضور ﷺ سب کچھ اللہ کے حکم سے کرتے تھے۔ اور آپ کی ہر بات دین ہے اور اس کی اطاعت فرض ہے، اس لئے آپ نے ان مسائل میں جو کچھ کیا اس میں ہم آپ کی اطاعت نہ کریں تو خود قرآن کی مذکورہ بالا آیتوں اور ان جیسی دوسری آیتوں پر عمل نہ ہوگا۔ اور اگر اطاعت کرنا چاہیں تو اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ ان اعمال کی تفصیل حدیث میں تلاش کریں کیونکہ قرآن میں اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی ہے۔ اور حدیث کے علاوہ کوئی ایسا ذریعہ نہیں جہاں سے یہ تفصیل مل سکتی ہو۔

خلاصہ یہ کہ خود قرآن کے بیان کے مطابق رسول کی اطاعت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک احادیث کو تسلیم نہ کرلیا جائے۔ اس لئے جو لوگ حدیث کے منکر ہیں وہ درحقیقت قرآن کے بھی منکر ہیں۔

منصب رسالت اور اس کا تقاضا:

مدھو پوری صاحب نے منصب رسالت کے بارے میں بھی زبان کھولی ہے۔ اور اس سلسلے میں انھوں نے جس بے دردانہ ظلم کا مظاہر کیا ہے کوئی مسلمان اس پر فریاد کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لکھتے ہیں:

''ایک بار پھر رسول کے معنی سن لیجئے! ارشاد ہوتا ہے۔﴿ يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ﴾ (یعنی اے رسول پہنچادے جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر

اترا ہے) آگے تاکید ہے۔﴿ وَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ﴾(یعنی اگر تو نے ایسا نہ کیا (یعنی تو نے پورا کا پورا نہ پہنچایا یا اپنی طرف سے کچھ گھٹا بڑھا دیا) تو تو نے رسالت کے فرائض انجام نہیں دیئے) اور سورہ نمل میں ہے۔﴿وَاَنْ اَتْلُوَ الْقُرْآنَ﴾ (یعنی رسول نے فرمایا کہ مجھ کو تو حکم ہوا ہے) اور یہ کہ میں قرآن پڑھ کر سنا دوں۔ (اس کے علاوہ نہیں) اس کے باوجود یہ الزام کہ آپ نے امت کو قرآن کے علاوہ دوسری کتابیں بھی دی ہیں یعنی'' حدیثیں" سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ

میں کہتا ہوں جس طرح بچھو کا زہر اس کے پچھلے حصہ یعنی ڈنک میں ہوا کرتا ہے اسی طرح اس بیان کا زہریلا حصہ بھی اس کے آخیر میں یعنی سورہ نمل والی آیت کی تشریح بلکہ تحریف والے حصے میں مضمر ہے۔ خیر سنئے!

اولاً: جب رسول کے فرائض رسالت انجام دینے کی صورت یہی ہے کہ آپ ﷺ نے دین میں کچھ گھٹایا بڑھایا نہیں ہے اور قرآن سے یہ بات لازماً معلوم ہے کہ آپ نے بہت سے ایسے کام انجام دیئے ہیں جن کی تفصیل وشرح قران میں نہیں ہے تو یہیں سے یہ نتیجہ نکل آیا کہ قرآن سے باہر حضور ﷺ کی یہ باتیں بھی دین ہیں۔ لہٰذا یہ جہاں کہیں بھی ملیں انھیں حاصل کرنا اور ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ دین کامل پر عمل نہیں ہوسکتا۔ اور یہ باتیں احادیث کے علاوہ کہیں مل نہیں سکتیں۔ اس کے باوجود یہ سمجھنا کہ حدیثیں قرآن سے مختلف الاصل، اس کے تقاضوں سے بے تعلق اور دین میں اضافہ ہیں۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ

ثانیا: سورہ نمل کی آیت ﴿وَاَنْ اَتْلُوَ الْقُرْآنَ﴾ کا جو مطلب آپ نے بیان کیا ہے کہ رسول کو صرف قرآن پڑھ کر سنا دینے کا حکم دیا گیا ہے اس کے علاوہ نہیں، یہ مطلب درحقیقت بدترین قسم کی تحریف ہے۔ خود اس آیت کے پہلے حرف ''واؤ'' کا تقاضا ہے کہ آپ کو صرف تلاوت قرآن کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ بلکہ آپ کو بہت سے احکامات دیئے گئے

ہیں، انھیں احکامات میں سے ایک حکم یہ بھی ہے کہ آپ قرآن پڑھ کر سنا دیں۔ مگر منکرین حدیث کی ڈھٹائی دیکھئے کہ وہ اس آیت کا یہ معنی بیان کرتے ہیں۔ کہ آپ کو قرآن پڑھ کر سنانے کے علاوہ کوئی حکم نہیں دیا گیا۔ ﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا، فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ﴾

اب آیئے، آپ کو قرآن سے بھی بتلا دیا جائے کہ آنحضور ﷺ کو جو بہت سے احکام دیے گئے ہیں ان میں سے چند خاص خاص احکام جن کا زیر بحث مسئلہ سے تعلق ہے وہ کیا ہیں؟ ارشاد ہے:

(الف) ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ یعنی ہم نے آپ کی طرف ذکر (یعنی قرآن) اتارا ہے، تا کہ لوگوں کی طرف جو چیز نازل کی گئی ہے آپ اسے کھول کھول کر بیان کر دیں۔

اس آیت میں حضور ﷺ کا کام یہ بتلایا گیا ہے کہ آپ قرآن کی تبیین کریں۔ تبیین کا معنی ہے کسی چیز کو کھول کھول کر بتلا دینا۔ یعنی اس میں جو اشارہ ہو اس کی توضیح کرنا، جو اجمال ہو اس کی تفصیل کرنا، جو ابہام اور پوشیدگی ہو اسے دور کرنا، متعدد احتمالات ہوں تو صحیح معنی اور ٹھیک مراد کی تعیین کرنا وغیرہ وغیرہ۔

ایک موٹی عقل کا آدمی بھی کم از کم اتنی بات تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ کسی کتاب کی شرح و توضیح محض اس کتاب کے پڑھ کر سنا دینے سے نہیں ہوتی بلکہ شرح کرنے والا اس کے الفاظ سے زائد کچھ کہتا ہے تا کہ سننے والا کتاب کا مطلب پوری طرح سمجھ جائے۔ اور اگر کتاب کی کوئی بات کسی عملی مسئلے سے متعلق ہو تو شارح عملی مظاہرہ (PRACTICAL DEMNSTRATION-) کر کے بتلاتا ہے کہ مصنف کا منشاء اس طرح عمل کرنا ہے۔ یہ نہ ہو تو کتاب کے الفاظ کا مطلب و مدعا پوچھنے والے کو پھر کتاب کے الفاظ ہی سنا دینا کسی

طفلِ مکتب کے نزدیک بھی شرح وتوضیح نہیں قرار پا سکتا۔ مثلاً اللہ نے حکم دیا ہے کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، حج، عمرہ کرو وغیرہ، اب اگر حضور ﷺ بھی زندگی بھر لوگوں کو یہی پڑھ کر سناتے رہتے کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، حج وعمرہ کرو، لیکن یہ نہ بتاتے کہ یہ سب کام کیسے کریں تو یہ تلاوت بالکل رائیگاں جاتی۔ بلکہ ایک قسم کا اضحوکہ بن کر رہ جاتی۔

اس کو بالکل یوں سمجھئے کہ کوئی حکیم صاحب کسی ناواقف انسان سے کہیں کہ فلاں دوا پتال جنتر کے ذریعہ تیار کرلو، وہ یقیناً جنتر کا مطلب پوچھے گا۔ اب اگر اس کے جواب میں حکیم صاحب یا ان کا کوئی نمائندہ پتال جنتر کی تلاوت شروع کردے لیکن اس کا مطلب نہ سمجھائے تو وہ انسان زندگی بھر کچھ نہیں سمجھ سکتا۔ بلکہ یہ ایک لغو تماشہ بن کر رہ جائے گا۔ لیکن اگر حکیم صاحب کا کوئی نمائندہ اس انسان کو پتال جنتر کی تفصیلات بتلادے تو یہی تفصیلات پتال جنتر کی تبیین کہلائیں گی۔ اور یہ تبیین خواہ جتنی بھی لمبی چوڑی ہو، اور اس میں جس قدر بھی قیود اور شرطیں ہوں وہ سب حکیم صاحب کا حصہ ہوں گی۔ اور اس پر عمل پیرا ہونا عین حکیم صاحب کے حکم کی پیروی کہلائے گی۔

بالکل اسی طرح جب اللہ تعالیٰ نے قرآن کی تبیین حضور ﷺ کے ذمہ کردی تو یہیں سے معلوم ہوگیا کہ قرآن میں کچھ ایسی باتیں ضرور ہیں جو شرح طلب ہیں۔ ورنہ تبیین کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ان شرح طلب چیزوں کا حضور ﷺ جو مطلب بھی بیان کریں۔ اور اس میں جس قدر قیود، شرطیں، تفصیلات اور پابندیاں لگائیں وہ سب اللہ کا حکم اور قرآن کا منشا ہیں۔ اور ان پر عمل کئے بغیر قرآن کے حکم پر عمل ہی نہیں ہوسکتا۔ یہی تفصیلات ''حدیث'' کہلاتی ہیں۔ جو لوگ ان تفصیلات پر ''مثلہ معہ'' کی پھبتی چست کرتے ہیں۔ وہ درحقیقت حضور ﷺ کی رسالت کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے۔ اور جو لوگ رسالت کے اس حق کے منکر ہیں وہ درحقیقت قرآن کے منکر ہیں۔ کیونکہ قرآن نے صراحۃً حضور ﷺ کو یہ حق عطا کیا ہے۔

ہماری اس بحث سے یہ بات طے ہوگئی کہ حضور ﷺ صرف قرآن پڑھ کر سنا دینے پر مامور نہیں تھے۔ بلکہ اس کے علاوہ قرآن کی شرح وتوضیح بھی آپ کی پیغمبرانہ ذمہ داری کا ایک حصہ تھی۔یعنی آپ قرآن کے شارح بھی تھے۔

آیئے رسالت کے چند اور پہلوؤں کے جلوے بھی دیکھ لیجئے! قرآن بڑی وضاحت کے ساتھ بتلاتا ہے کہ آپ اس امت کے معلم اور مربی بھی تھے۔ارشاد ہے۔

(ب)﴿ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ﴾ (سوہ بقرہ آیت ۱۲۹)

یعنی ابراہیم واسماعیل علیہما اسلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کے دوران دعا کی ،اے ہمارے پروردگار ان لوگوں میں خود ان ہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرما جو انھیں تیری آیات پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

(ii) ﴿كَمَا اَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُوا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ﴾ (سورہ بقرہ آیت ۱۵۱)

جس طرح ہم نے تمہارے اندر خود تمہی میں سے ایک رسول بھیجا جو تم کو ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمھارا تزکیہ کرتا ہے اور تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور تمھیں وہ باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے۔

(iii) ﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ اِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (آل عمران۔۱۶۴)

اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا جبکہ ان کے اندر انھیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

(iv) ﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْاُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيهِمْ

وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ﴿ (سورہ جمعہ:۲)

وہی ہے جس نے امیّوں کے درمیان خود انھیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

ان آیات میں بار بار جس بات کو بتاکید دہرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف قرآن سنا دینے کے لئے نہیں بھیجا تھا۔ بلکہ اسکے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے:

۱۔ ایک یہ کہ آپ لوگوں کو تعلیم دیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ اس کتاب کے منشاء کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں۔ اور

۳۔ تیسرے یہ کہ آپ افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں۔ یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں۔ اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشو ونما دیں۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں باتیں تلاوت قرآن سے زائد ہیں۔ کیونکہ اگر یہ عین تلاوت قرآن ہوتیں تو تلاوت قرآن کے بعد الگ سے ان کا ذکر فضول ہوتا۔

مذکورہ بالا آیات سے یہ بات بھی متعین ہو جاتی ہے کہ کتاب و حکمت کی تعلیم اور تزکیہ نفس آپ کی رسالت کی ذمہ داریوں کا ایک حصہ ہیں۔ لہٰذا آپ کو رسول ماننے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کی اس تعلیم و تزکیہ کو بھی قبول کیا جائے۔ ورنہ آپ کی رسالت اور قرآن دونوں کا انکار ہو جائے گا۔ اور یہ معلوم ہے کہ تعلیم و تزکیہ کی تفصیلات حدیث کے علاوہ کہیں اور نہیں مل سکتیں۔ ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ اب جس کا جی چاہے ایمان لائے جس کا جی چاہے کفر کرے۔

(ج) قرآن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس امت کے پیشوا، قائد اور نمونہ تقلید بھی تھے۔ ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (اِلیٰ) قُلْ اَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِيْنَ﴾ (آل عمران ۳۱/۳۲)

اے نبی ﷺ کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔۔۔ کہو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

سورہ احزاب میں ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ (۳۱)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو پیشوا قرار دیا ہے۔ ان کی زندگی کو نمونہ تقلید ٹھہرایا ہے، اپنی محبت کا دارومدار پیغمبر ہی کی اتباع پر رکھا ہے۔ اور اس سے منہ موڑنے کو کفر قرار دیا ہے۔

ہمارے پچھلے مباحث سے یہ بات بھی صاف ہو چکی ہے کہ نہ یہاں رسول سے قرآن مراد لینے کی گنجائش ہے۔ نہ آپ کے اسوۂ حسنہ یا اعمال زندگی کی تفصیلات قرآن کے اوراق میں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ اس کا واحد ذریعہ ذخیرۂ احادیث ہیں۔ اب اگر کوئی شخص اللہ کی نگاہ میں محبوب بننا اور آخرت کے دن کی امید رکھنا چاہتا ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ انھیں ذخیرۂ احادیث کی طرف پلٹے۔ اور چھان پھٹک کر آنحضور ﷺ کے ٹھیک ٹھیک نمونہ زندگی کی پیروی کرے۔ یہ عین اس منصب رسالت پر ایمان لانے کا تقاضا ہے جسے قرآن نے آنحضور ﷺ کو عطا کیا ہے۔

ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آنحضورﷺ کا کام صرف قرآن پڑھ کر سنادینا نہ تھا۔ بلکہ اپنی عملی زندگی کے ہر گوشے میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کی نمائندگی کرنا۔ اور اپنے ہر عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور اس کی پسندیدگی کی نشاندہی کرنا بھی آپ کے منصب رسالت کا ایک اہم ترین جزو تھا۔

(د) قرآن نے آنحضورﷺ کو تشریعی اختیارات بھی عطا کئے ہیں۔ یعنی آپ کو شارع قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ (الاعراف:۱۷۵)

وہ (رسول) ان کو معروف کا حکم دیتا ہے اور انھیں منکر سے روکتا ہے اور ان کے لئے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے۔ اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتارتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

یہ آیت اس بارے میں صریح اور دوٹوک ہے کہ اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی۔ بلکہ جو کچھ نبیﷺ نے حلال و حرام ٹھہرا دیا ہے جس چیز کا حکم دیدیا ہے اور جس چیز سے منع کر دیا ہے وہ بھی اللہ کے دیئے ہوئے اختیارات سے ہے اس لئے وہ بھی احکام الٰہی کا ایک حصہ ہے اور اس کی پابندی بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآنی احکام کی پابندی ضروری ہے۔ یہی بات ایک دوسرے مقام پر بھی بیان فرمائی ہے۔ ارشاد ہے۔

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ (سورہ حشر:۷)

جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے منع کر دیں اس سے رک جاؤ، اور اللہ

سے ڈرو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

پچھلی آیت کی طرح اس آیت میں بھی امر و نہی اور تحلیل و تحریم کے تشریعی اختیارات حضور ﷺ کو سونپے گئے ہیں۔ آپ کی اس حیثیت کو تسلیم کرنا تقویٰ کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔ اور اس سے گریز و انکار کو سخت سزا کا سبب ٹھہرایا گیا ہے۔

منکرین حدیث ان دونوں آیتوں میں تحریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں رسول سے مراد قرآن ہے۔ گویا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ سے غلطی ہوگئی۔ اس نے بھول کر قرآن کے بجائے رسول کا لفظ استعمال کر دیا۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

(ہ) قرآن ہی ہمیں یہ بھی بتلاتا ہے کہ حضور ﷺ قاضی اور جج تھے۔ ارشاد ہے:

(i) ﴿اِنَّـا اَنْـزَلْـنَـا اِلَيْكَ الْـكِـتَـابَ بِـالْـحَـقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰكَ اللّٰهُ﴾ (النساء:۱۰۵)

ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی، تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی میں فیصلہ کریں۔

(ii) ﴿وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾ (الشوریٰ:۱۵)

آپ کہہ دیجئے کہ میں اس کتاب پر ایمان لایا ہوں جو اللہ نے نازل کی ہے، اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں۔

(iii) ﴿اِنَّـمَـا كَـانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْآ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ (النور:۵۱)

ایمان لانے والوں کا قول تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اسکے رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو وہ کہیں ہم نے سنا اور مان لیا۔

(iv) ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ

يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْداً﴾ (النساء : ٦١)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی نازل کردہ کتاب کی طرف اور رسول کی طرف تو تم منافقوں کو دیکھتے ہو کہ وہ تم سے کنی کتراتے ہیں۔

(۷)﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ، ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء:٦٥)

تیرے رب کی قسم، وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے جب تک کہ اپنے جھگڑوں میں تجھے فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر تم جو فیصلہ کرو اس کے متعلق اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں، اور بلا چوں چرا تسلیم کرلیں۔

ان آیات میں حضورﷺ کو اس امت کے ہر طرح کے تمام تنازعات کا فیصل اور جج قرار دیا گیا ہے۔ اور ایسا جج قرار دیا گیا ہے کہ آپ کے فیصلہ پر دل میں بھی تنگی محسوس ہو تو ایمان سلامت نہ رہے گا۔ بلکہ یہ نفاق کی کھلی ہوئی اور صریح علامت ہوگی۔

انسانی تنازعات کی بے شمار قسمیں ہیں۔ لیکن قرآن دیکھ جایئے۔ چند ایک موٹے موٹے فوجداری اور دیوانی قوانین کے علاوہ مزید کوئی قانون قرآن نے بیان نہیں کیا ہے۔ بلکہ آنحضورﷺ کو جج قرار دیدینا کافی سمجھا ہے۔ پھر حضورﷺ نے جو فیصلے کئے اور جن اصول وضوابط اور جن قوانین کی بنیاد پر کئے ان کا قرآن میں کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ بلکہ اوپر جو آیات نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے چوتھی آیت میں **ما انزل** (یعنی قرآن) کے بعد الگ سے رسول کا ذکر کر کے یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ فیصلہ حاصل کرنے کے لئے اس امت کے پاس دو مستقل مرجع ہیں۔ ایک قرآن اور دوسرے رسول۔ اور یہ دونوں مل کر ایک بنیاد یعنی مرضی الٰہی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اب جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں قرآن سے باہر نہ حضورﷺ کے فیصلوں کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اور نہ کہیں ملیں تو مانا جائے گا وہ لوگ درحقیقت قرآن کی طرف

سے مقرر کی ہوئی ایمان کی لازمی شرط کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسے لوگ کس منہ سے اپنے آپ کو "اہل قرآن" کہتے ہیں۔ یہ لوگ تو درحقیقت قرآن کے منکر اور سخت مخالف ہیں۔

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

مندرجہ بالا آیات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آنحضور ﷺ کا کام صرف قرآن پڑھ کر سنا دینا نہیں تھا۔ بلکہ آپ اس امت کے لئے قاضی اور جج بھی تھے۔

(و) قرآن میں بھرپور صراحت کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ اللہ کے مقرر کئے ہوئے حاکم اور فرمانروا تھے۔ ارشاد ہے:

(i) ﴿وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ﴾ (النساء:۶۴)

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لئے کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

(ii) ﴿وَمَنۡ يُّطِعِ الرَّسُوۡلَ فَقَدۡ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء:۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

(iii) ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ يُبَايِعُوۡنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوۡنَ اللّٰهَ﴾ (الفتح:۱۰)

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

(iv) ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِيۡعُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَلَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَكُمۡ﴾ (محمد:۳۳)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال کو باطل نہ کرو۔

(v) ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤۡمِنٍ وَّلَا مُؤۡمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوۡلُهٗۤ اَمۡرًا اَنۡ يَّكُوۡنَ لَهُمُ الۡخِيَرَةُ مِنۡ اَمۡرِهِمۡ وَمَنۡ يَّعۡصِ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيۡنًا﴾ (الاحزاب:۳۶)

اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول کر دیں تو پھر ان کیلئے اپنے اس معاملہ میں خود کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار باقی رہ جائے۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں پڑ گیا۔

(vi) ﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ کُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ﴾ (النساء:۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اس کو پھیر دو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اگر تم ایمان رکھتے ہو اللہ پر اور روز آخرت پر۔

ان تمام آیات سے یہ بات دوٹوک طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ حضور ﷺ اس امت کے حاکم و فرمانروا تھے، اور آپ کی حکومت و فرمانروائی ایک عام حکمراں کی حیثیت سے نہ تھی کہ آپ کی مخالفت اور آپ کے ساتھ نزاع کی گنجائش ہوتی۔ بلکہ آپ کی حکومت و فرمانروائی آپ کے منصب رسالت کا ایک حصہ تھی۔ اسی لئے آپ کی اطاعت اللہ کی اطاعت اور آپ کی بیعت اللہ کی بیعت قرار دی گئی۔ آپ کے فیصلہ کے بعد کسی کیلئے کوئی اختیار باقی نہیں رکھا گیا۔ اور دیگر حکمرانوں کے ساتھ نزاع کی صورت میں آپ کو اللہ کے بعد آخری مرجع قرار دیا گیا۔

یہ بات متعین ہو جانے کے بعد کہ آپ اپنی پیغمبرانہ حیثیت میں اسلامی حکومت کے حاکم و فرمانروا تھے۔ یہ بات ضروری ہو جاتی ہے کہ آپ نے جو نظام حکومت برپا کیا، جن اصولوں اور بنیادوں پر برپا کیا، جن ضوابط پر اسلامی ریاست کی تشکیل کی، صلح و جنگ کے جو قواعد مرتب کئے اور حکومت کے مختلف اداروں اور محکموں کے لئے جو قوانین عطا کئے ان سب کو بلا چوں چرا تسلیم کیا جائے۔ اور مسلم معاشرہ کی اجتماعی تشکیل و تعمیر کیلئے ان کی بے

لاگ پیروی کی جائے۔ اب جو لوگ حدیث کی استنادی اور قانونی حیثیت تسلیم نہیں کرتے ہم ان سے عرض کریں گے کہ وہ حضور ﷺ کے اس نظام حکومت، اصول وضوابط، قواعد وقوانین اور جہد وعمل کی تفصیلات قرآن سے پیش فرمائیں۔ (کیونکہ آپ کے اسوہ کی پیروی کے بغیر آخرت میں کامیابی کی توقع ہی فضول ہے) دنیا جانتی ہے کہ یہ تفصیلات قرآن سے پیش نہیں کی جاسکتیں، ان کے علم کا واحد ذریعہ ذخیرۂ احادیث ہی ہے۔ پس جو لوگ اس کے منکر ہیں وہ درحقیقت قرآن کے احکام وہدایات اور اس کے لازمی تقاضوں کے بھی منکر ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ حضور ﷺ صرف قرآن پڑھ کر سنا دینے پر ہی مامور نہیں تھے، بلکہ آپ کی پیغمبرانہ ذمہ داری میں تلاوت قرآن کے علاوہ بھی بہت سے کام شامل تھے یعنی آپ کتاب اللہ کے شارح اور مفسر تھے۔ امت کے معلم اور مربی تھے۔ پیشوا، رہنما اور قائد تھے، شارح، قاضی اور جج تھے اور حاکم وفرمانروا تھے۔ آپ کے یہ مناصب قرآن پاک کی رو سے آپ کی رسالت کے اجزاء لاینفک (اٹوٹ ٹکڑے) ہیں۔ جو شخص ان میں سے کسی بھی جزو کا یا اس کے لازمی تقاضوں کا انکار کرتا ہے وہ درحقیقت آپ کی رسالت کا اور خود قرآن مجید کا انکار کرتا ہے۔ کیونکہ یہ سارے مناصب قرآن ہی کی طرف سے آپ کو عطا کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد بڑے ٹھنڈے دل سے اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ آپ نے اپنے مذکورہ بالا مناصب اور حیثیات کی رو سے جو کام انجام دیئے تھے۔ اور جو قرآن کے بعد خود قرآن ہی کی رو سے شریعت اسلامی کا دوسرا ماخذ ومرجع ہیں آخر آپ کے ان کاموں کی تفصیلات ہمیں کہاں سے دستیاب ہونگی؟ قرآن میں یہ تفصیلات تو بہرحال نہیں ہیں۔ اور قرآن کے باہر حدیث کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں ہے جس سے یہ تفصیلات معلوم کی جاسکتی ہوں۔ اس لئے قرآن کی ان ہدایات کو تسلیم کرنے کا لازمی نتیجہ اور تقاضا یہ ہے کہ احادیث کو حجت اور سند تسلیم کیا جائے۔ اگر احادیث کا انکار کر دیا جائے تو حضور کو عطا کئے

جانے والے یہ سارے مناصب بے معنی اور لغو ہو کر رہ جائیں گے۔ اس لئے احادیث کا انکار صاف اور صریح طور پر خود قرآن کا اور آنحضور ﷺ کی رسالت کے منصب اور پیغمبرانہ حیثیتوں کا انکار ہے۔

مقام عبرت:

مقام عبرت ہے کہ جو لوگ حدیث کے منکر ہیں وہ خود تو قرآن کی آیات کا مطلب بیان کرتے ہیں۔ اس کی شرح و توضیح کرتے ہیں۔ اس سے نتیجہ نکالتے ہیں۔ کسی آیت کو کسی آیت سے جوڑ کر اور کسی کو کسی سے کاٹ کر مختلف مسئلوں کی مختلف صورتیں بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ بلکہ اپنی عقلی تک بندیوں کی بنیاد پر کسی آیت کے ایک مطلب کو درست اور بقیہ مطالب کو غلط بتاتے ہیں۔ مگر رسول اللہ ﷺ کو تلاوت قرآن کے علاوہ کسی قسم کا کوئی حق دینے کو تیار نہیں۔

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

دین کو کون کامل مانتا ہے اور کون نہیں؟

ہماری پچھلی گذارشات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ درحقیقت ہم ہی قرآن کو اور دین کو کامل مانتے ہیں۔ کیونکہ ہم ان تمام شرائط و تفصیلات کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہیں جنھیں قرآن نے جزو دین قرار دے کر ہمیں ان کا پابند بنایا ہے۔ یعنی قرآن نے ہمیں جو چیز جہاں سے لینے اور ماننے کا حکم دیا ہے ہم اسے وہیں سے لیتے اور مانتے ہیں۔ مثلاً رسول کے دائرۂ رسالت میں جو کچھ آتا ہے ہم سب کو مانتے ہیں کہ آپ ﷺ نے رسول ہونے کی حیثیت سے قرآن کے ان تمام الفاظ، آیات، اصطلاحات، مجملات، مبہمات، اشاروں کنایوں وغیرہ کی شرح و توضیح کی جن کی شرح و توضیح کی ضرورت تھی۔ ہم مانتے ہیں کہ دین کے بارے میں آپ کا ارشاد اللہ کی مرضی کے عین مطابق ہوا کرتا تھا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ

آپ حاکم اور جج تھے اور لوگوں کے تمام تنازعات کے فیصلے کیا کرتے تھے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ مربی و معلم تھے اور اسلامی حکومت کے سربراہ تھے۔ آپ نے مسلمانوں کی انفرادی اصلاح و تربیت سے لے کر اجتماعی تنظیم اور ریاست کی تشکیل تک کے سارے اصول و ضوابط منضبط کئے۔ اور ان کی بنیاد پر تزکیہ نفس سے لے کر حکومت کے ادارات تک کو منظم فرمایا۔ پھر ہم تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے سارے کام رسول ﷺ ہونے کی حیثیت سے انجام دیئے۔ اس لئے تمام حیثیتوں سے آپ کا ہر اسوہ جزو دین اور واجب الاطاعت ہے۔

غرض ہم دین کو ہر حیثیت سے ہر اعتبار سے اور ہر طور پر مکمل مانتے ہیں۔ قرآن پر اس کے تمام تقاضوں سمیت ایمان لاتے ہیں۔ اور رسول کو ان کے پورے دائرۂ رسالت اور اس دائرۂ رسالت کے تمام تقاضوں سمیت رسول مانتے ہیں۔ یعنی قرآن و رسول پر ایمان لانے کے نتیجے میں جن جن چیزوں کو ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے ہم ان سب کو مانتے ہیں اور اسی لئے ہم حدیث کے ماننے کو ناگزیر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ حدیث کے بغیر نہ قرآن کے تقاضے پورے کئے جاسکتے ہیں اور نہ رسالت کے تمام دائروں کو مانا جاسکتا ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ قرآن نے سارے مسائل کا حل اجمالاً یا تفصیلاً بیان کردیا ہے۔ اور ان سب کی اصل اور جڑ یہ قرار دی ہے۔

﴿وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَھُوْا﴾

رسول جو کچھ تمہیں دیں اسے لے لو، اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ۔

پس قرآن نے رسول ﷺ کو سارے مسائل کے حل کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اس لئے جن مسائل کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ان مسائل میں رسول ﷺ کے اقوال وافعال کی طرف پلٹنا عین اتباع قرآن ہے۔ اور اس طرح خود قرآن کی رہنمائی میں تمام مسائل کا حل نکل آیا ہے۔

یہ تو ہمارا عقیدہ اور مسلک ہوا۔لیکن ہمارے برخلاف منکرین حدیث اگرچہ بڑے اونچے آہنگ کے ساتھ گلا پھاڑ پھاڑ کر دین کامل اور کتاب کامل کا نعرہ لگاتے ہیں۔مگر وہ درحقیقت نہ دین کو کامل مانتے ہیں۔نہ قرآن کو۔کیونکہ وہ رسول کو معلم مانتے ہیں نہ مربیٰ نہ قائدنہ رہنما،نہ پیشوانہ رہبر،نہ جج نہ فیصل،نہ قاضی نہ حکمراں،نہ شارح نہ مفسرٗنہ قانون ساز، غرض وہ رسول کے ان تمام مناصب اور حیثیتوں کا انکار کرتے ہیں۔جو اللہ نے آپ کو عطا کی تھیں،وہ صرف آپ کو ڈاکیہ کی حیثیت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ کا کام صرف پڑھ کر سنا دینا تھا اس کے علاوہ نہیں۔

ان کے اس انکار کا نتیجہ یہ ہے کہ ان سے دین کا وہ سارا سرمایہ ہی فوت ہوگیا ہے جو آنحضورﷺ کے مذکورہ بالا مناصب رسالت کی بنیاد پر قائم ہے۔اب ان کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ ایک ادھورا دین ہے۔جو زندگی کے بیشتر شعبوں میں رہنمائی کرنے سے قاصر ہے۔اور قرآن کے نام پر جو کچھ ہے وہ محض ایک ایسی کتاب ہے جس کی وہ صرف تلاوت کر لیا کریں گے۔اس کی رہنمائی قبول نہیں کریں گے۔

منکرین حدیث نے انکار حدیث کیلئے جو اصولی وجوہ یا ''دلائل'' پیش کئے ہیں یہاں تک ان پر بحث مکمل ہوگئی۔اور آپ نے دیکھ لیا کہ ان کے اصول تسلیم کر لینے سے حدیث ہی کا نہیں بلکہ قرآن کا بھی انکار ہو جاتا ہے۔ان مباحث کے علاوہ منکرین حدیث نے عذاب قبر اور نماز پنجگانہ کے مسئلے کو بھی بڑے زور وشور سے اٹھایا ہے۔اس لئے اگلے صفحات میں ان پر بحث ملاحظہ فرمالیں۔

عذاب قبر کا ثبوت:

منکرین حدیث ایک شبہہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ حدیثوں میں عذاب قبر کا ذکر آتا ہے حالانکہ اس کا ذکر نہ قرآن میں آیا ہے نہ عقل اسے تسلیم کرتی ہے۔ہم مردوں کو دیکھتے

ہیں ان کا جسم گلتا سڑتا رہتا ہے۔ مگر انھیں عذاب قبر ہوتا نظر نہیں آتا۔ اس لئے اس ذخیرۂ حدیث کا کیسے اعتبار کیا جائے جس میں ایسی غلط باتیں ہیں؟

ہم کہتے ہیں کہ منکرین حدیث کی یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ عذاب کا مطلب ہے عذاب برزخ۔ یعنی موت کے بعد اور قیامت سے پہلے کی مدت میں عذاب کا ہونا۔ اتنی سی بات ذہن میں رکھ کر سنئے۔ قرآن میں جگہ جگہ بتایا گیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی۔ فرعون نہ مانا۔ بہت سے نشانات دکھائے گئے تب بھی نہ مانا۔ آخر موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر نکل پڑے۔ فرعون نے اپنے لاؤلشکر سمیت پیچھا کیا۔ اللہ نے بنی اسرائیل کے لئے دریا میں راستہ بنا دیا۔ وہ پار ہونے لگے، فرعون بھی اپنے لشکر سمیت اسی راستہ پر چل پڑا۔ بنی اسرائیل پار نکل گئے۔ اور فرعون اپنے لشکر سمیت ڈبو دیا گیا۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورہ مومن میں فرمایا گیا ہے۔

﴿ وَوَقَاهُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِ مَامَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ۔ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ﴾ (پ/۲۴)

یعنی اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور قوم فرعون کی بری تدبیروں سے بچا لیا۔ اور قوم فرعون کو برے عذاب نے گھیر لیا۔ یہ لوگ صبح وشام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں۔ اور جس دن قیامت قائم ہوگی (اللہ حکم دے گا) قوم فرعون کو نہایت سخت عذاب میں داخل کر دو۔

ظاہر ہے موسیٰ علیہ السلام کو بچا کر فرعون اور اس کی قوم کو جس عذاب میں گھیرا گیا تھا وہ دریا میں ڈبو دیئے جانے والا عذاب ہے۔ جس سے پورا فرعونی لشکر مر کر ختم ہو گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ ان کے مر جانے کے بعد اور قیامت قائم ہونے سے پہلے ان کے بارے میں جو یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ان کو صبح وشام آگ پر پیش کیا جاتا ہے اگر یہ عذاب برزخ نہیں ہے تو کون سا عذاب ہے؟ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ فرعون اور اس کی قوم

کو یہ عذاب کیوں دیا جارہا ہے؟ جواب صاف ہے۔ان کا قصور قرآن میں جگہ جگہ یہی بتایا۔ گیا ہے کہ انھوں نے سرکشی کی۔یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان نہیں لائے۔ان کی اطاعت وپیروی نہیں کی۔شرک وبت پرستی اور نافرمانی وتکبر کی راہ پر چلتے رہے۔اب سوال یہ ہے کہ ان برائیوں اور ان جرائم کی وجہ سے جب فرعون اور اسکی قوم کو عالم برزخ میں عذاب ہورہا ہے تو جولوگ اور قومیں یہی قصور کر کے دنیا سے جائیں گی انہیں عالم برزخ میں عذاب کیوں نہیں ہوگا؟ کیا اللہ بے انصاف ہے کہ قوم فرعون نے ایک جرم کیا تو انھیں عذاب دے رہا ہے۔لیکن وہی جرم دوسری قومیں کریں گی تو انھیں عذاب نہیں دے گا؟

یہ عذر بھی بچگانہ ہے کہ ہم مردوں کے جسم کو عذاب ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے۔فرعون کا جسم بھی تو مصر کے میوزیم میں محفوظ ہے۔جس میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔لیکن قرآن کہتا ہے کہ اسے صبح وشام عذاب ہورہا ہے۔کیا قرآن کے اس بیان کا اعتبار نہیں؟ اگر اعتبار ہے اور یقیناً ہے تو حدیث میں مردوں کو عذاب دیئے جانے کا جو بیان ہے اس کا اعتبار کیوں نہیں؟

عذاب قبر کے انکار کے مزید دلائل اور ان کا جواب:

دلائل:

آیئے! اس کے بعد عذاب قبر کے انکار کے سلسلے میں مدھوپوری ''محقق'' صاحب کا سرمایہ تحقیقات'' اور اس کا جائزہ بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔مدھوپوری صاحب لکھتے ہیں۔

سوال:۔ عذاب قبر کا عقیدہ کیسا ہے؟

جواب:۔ بالکل غلط اور بے بنیاد ہے! قبر کوئی جہنم تھوڑی ہی ہے جو وہاں عذاب ہوگا؟ قبر تو مردوں کے گاڑنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔(گنہگاروں کے لئے عذاب کی جگہ کو نہیں) **ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ** یعنی پھر ان کو موت دی اور قبر میں گاڑ دیا! حتیٰ کہ قرآن کی اصطلاح میں تو

علی الاطلاق ''مردے'' کو ''قبر'' کہا گیا ہے۔ گویا ''موت'' کا دوسرا نام قبر ہے! وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ (۸۲/۴) اور جس دن قبریں زندہ کر کے اٹھائی جائیں گی! غرض عذاب قبر کا عقیدہ بالکل من گھڑت، غیر اسلامی اور غیر قرآنی ہے۔

سورہ نمل میں ہے ﴿اِنَّکَ لَاتُسْمِعُ الْمَوْتیٰ﴾ (اے رسول ﷺ! تو مردوں کو اپنی بات نہیں سنا سکتا) پھر سورۂ فاطر میں ہے ﴿وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ﴾ (اے رسول ﷺ! تو قبر والوں کو اپنی باتیں نہیں سنا سکتا) ایک ہی شئی کو دو ناموں سے پکارا۔ ایک ''مردے'' اور دوسرا ''قبر والے''۔

عذاب وثواب (یعنی آرام و تکلیف) کا انحصار زندگی پر ہے، اگر زندگی نہیں تو عذاب وثواب کا تصور محض باطل ہے۔ اور یہاں قبر میں ظاہر ہے ''زندگی'' نہیں ''موت'' ہے ﴿ثُمَّ اِنَّکُمْ بَعْدَ ذٰلِکَ لَمَیِّتُوْنَ﴾ (۲۳/۱۵) پھر تم اس دنیاوی زندگی کے بعد مر جاؤ گے۔ ﴿ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَةِ تُبْعَثُوْنَ﴾ (۲۳/۱۶) پھر تم قیامت ہی کے دن زندہ کئے جاؤ گے! قیامت میں آخر مردوں کو زندہ کرنے کا مقصد بھی تو یہی ہے تاکہ اس دن ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ ﴿اِنَّ السَّاعَةَ آتِیَةٌ اَکَادُ اُخْفِیْهَا لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا تَسْعٰی﴾ (طٰہٰ) یعنی یہ کہ قیامت کی گھڑی آنے والی ہے اس کو ہم نے چھپا رکھا ہے تاکہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دیا جائے۔ اور گنہگاروں کو عذاب کرنے کے لئے جہنم کی آگ بھی اسی دن سلگائی جائے گی۔ ﴿وَاِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ﴾ (تکویر) یعنی اور جس وقت جہنم دہکائی جائے گی۔ اب قبر ہی میں زندگی ہے اور عذاب وثواب کا سلسلہ جاری ہے تو قیامت اور جنت وجہنم وغیرہ سب سے انکار ہو جاتا ہے (اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ)

مکے والوں سے کہا گیا تھا کہ دنیاوی زندگی کے علاوہ ایک دوسری زندگی بھی ہوگی یعنی آخرت کی زندگی۔ انھوں نے آخرت کی زندگی سے انکار کیا۔ کہا ﴿اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا

الدُّنیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ﴿۲۳/۳۷﴾ یعنی زندگی تو بس یہی دنیاوی زندگی ہے، یہیں ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور قیامت میں ہمیں زندہ ہونا نہیں ہے۔ چنانچہ دو زندگی کی جگہ صرف ایک زندگی ماننے پر انھیں کافر کہا گیا۔ اب دو زندگی کی جگہ تین زندگی ماننے والے کیا مومن رہیں گے؟

جواب

عذاب قبر اور ثواب قبر کے مزید قرآنی دلائل:

مدھو پوری دلائل ختم ہوئے۔ ہم نے اس کا جو جواب روانہ کیا تھا اب اسے ملاحظہ فرمایئے! آپ نے عذاب قبر کو بالکل غلط اور بے بنیاد بتایا ہے اور اس کی پہلی دلیل یہ ارشاد فرمائی ہے کہ قبر مردہ گاڑنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ گنہگاروں کے لئے عذاب کی جگہ کو نہیں۔ پھر آپ نے **واسأل القرية** والی آیت کو فراموش کرتے ہوئے قرآن سے یہ نکتۂ لطیف مستنبط فرمایا ہے کہ مردے کو قبر کہا گیا ہے۔ گویا ''موت'' کا دوسرا نام قبر ہے۔

اس ''نکتۂ لطیف'' پر تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، البتہ اتنا ضرور بتا دیجئے کہ مردے کو قبر کہا گیا تو موت کا نام قبر کیسے ہو گیا؟ کیا مردہ اور موت ایک ہی چیز ہے۔ پھر آپ یہ بتلایئے کہ اگر قبر مردوں کے گاڑنے کی جگہ ہے تو ان کے لئے عذاب کی جگہ کیوں نہیں ہو سکتی؟ آخر ان دونوں میں تضاد اور ٹکراؤ کیا ہے۔ کیا کوئی کمرہ کسی کی رہائش گاہ ہو تو وہ اسکے عذاب کی جگہ نہیں ہو سکتا۔ اس کمرے میں اسے سانپ اور بچھو نہیں ڈس سکتے۔ اس کے جسم میں ہلکی یا شدید قسم کی کوئی بیماری نہیں ہو سکتی۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے حملے نہیں ہو سکتے۔ اگر ایک کمرہ ایک شخص کی رہائش گاہ بھی ہو سکتا ہے اور عذاب گاہ بھی تو پھر قبر مردہ گاڑنے کی جگہ ہوتے ہوئے اس کی عذاب گاہ کیوں نہیں ہو سکتی۔

﴿ اِنَّكَ لَا تُسمِعُ المَوْتٰى﴾ اور ﴿وَمَآأَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ کو آپ نے سیاق وسباق سے کاٹ کر جس مفہوم میں لیا ہے اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے (حالانکہ وہ صحیح نہیں ہے) تو اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوسکتا ہے کہ دنیا کے انسان خواہ وہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں اپنے بل بوتے پر اپنی آوازیں اہل قبور تک نہیں پہنچا سکتے۔ اس سے کہاں لازم آتا ہے کہ اہل قبور تک اللہ تعالیٰ اور اس کے پیدا کئے ہوئے بے حد وحساب وسائل وذرائع اور اسباب وآلات کے ذریعہ بھی نہ کسی آرام وسکون کی بو پہنچ سکتی ہے، اور نہ سختی اور عذاب کا اثر پہنچ سکتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ ''عذاب وثواب کا۔۔۔انحصار زندگی پر ہے۔۔۔۔اور یہاں قبر میں ظاہر ہے'' زندگی'' نہیں موت ہے۔ اور اس پر اپنے استدلال کیا ہے سورہ مومنون کی آیات (۱۵اور۱۶) سے اور آیت ۱۶ کا ترجمہ آپ نے یوں کیا ہے'' پھر تم قیامت ہی کے دن زندہ کئے جاؤ گے''

ظاہر ہے کہ آپ کے استدلال کا پورا دارومدار مذکورہ بالا ترجمہ پر ہے جس میں قیامت کے بعد لفظ ''ہی'' لگا ہوا ہے۔ اور بعثت کا مفہوم صرف زندہ کرنا لیا گیا ہے۔

اور اس استدلال کی بناء پر آپ یقین کئے بیٹھے ہیں بلکہ یقین دلاتے پھر رہے ہیں کہ بس یہ دنیاوی زندگی ہے، اور اس کے بعد قیامت کی زندگی ہوگی۔ اگر ان دو زندگیوں کی درمیانی مدت میں کوئی اور زندگی تسلیم کر لی گئی تو ایمان سلامت نہیں رہ جائے گا آپ اپنے ان الفاظ کو ملاحظہ فرمایئے۔

''چنانچہ دو زندگی ماننے کی جگہ صرف ایک زندگی ماننے پر انھیں (اہل مکہ کو) کافر کہا گیا۔ اب دو زندگی کی جگہ تین زندگیاں ماننے والے کیا مومن رہیں گے؟''

سوال یہ ہے کہ جب خود آپ کے اقرار کے مطابق زندگی کے بغیر عذاب وثواب کا تصور باطل ہے بلکہ باطل محض ہے۔ اور دنیاوی زندگی کے خاتمے کے بعد اور قیامت والی

زندگی کے آغاز سے پہلے کسی زندگی کو تسلیم کر لینے سے ایمان سلامت نہیں رہ سکے گا تو خود قرآن کی تصریح کے مطابق فرعون اور آل فرعون کو اس دنیاوی زندگی کے خاتمے کے بعد یعنی سمندر میں غرق کر دیئے جانے کے بعد اور قیامت کے دن سے پہلے "عُرِضَ عَلَى النَّارِ غُدُوًّا وَّعَشِيًّا" (صبح و شام آگ پر پیش کئے جانے) کا جو عذاب ہو رہا ہے اس کا یقین رکھنے والے مومن ہوں گے یا کافر؟ کیونکہ ان کے عذاب دینے جانے کا تصور باطل محض ہوگا اگر ان کے لئے زندگی تسلیم نہ کی جائے۔ اور اگر تسلیم کر لی جائے تو یہ تیسری زندگی ہوگی جس کے ماننے والوں کے متعلق آپ پوچھتے پھر رہے ہیں کہ کیا وہ مومن رہیں گے؟

ہاں اسی قرآن میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک شخص کو بلکہ اس کے گدھے کو بھی اللہ تعالیٰ نے سو سال کے لئے موت دیدی تھی۔ پھر اس شخص کو پیدا کیا اور اس کے سامنے اس کے گدھے کو زندہ کیا۔ (دیکھئے سورہ بقرۃ آیت ۲۵۹)

قرآن میں مختلف پیرایوں سے یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی دنیا میں لوگوں کے سامنے اللہ کے اذن سے مردوں کو زندہ کرتے تھے (۱) قرآن میں یہ بھی مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے جن لوگوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کو "جہرۃ" دیکھنے کا مطالبہ کیا تھا انھیں صاعقہ (بجلی) نے پکڑ لیا، پھر انھیں ان کی موت کے بعد "زندہ" کیا گیا۔ ﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ (سورہ بقرۃ آیت ۵۶)

سوال یہ ہے کہ یہ زندگیاں جو حیات دنیاوی کے خاتمے کے بعد اور قیامت کا دن آنے سے پہلے پائی گئی ہیں کیا تیسری زندگی نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو کیا ان کو تسلیم کرنے والے کا ایمان محفوظ رہے گا؟

---

(۱) ذرا غور فرمایئے۔ آپ ایک آیت کے اپنے مزعومہ مفہوم کی روشنی میں فرما رہے ہیں کہ حضور ﷺ مردوں کو اپنی آواز نہیں سنا سکتے اور یہاں قرآن تصریح کر رہا ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو آواز سنانا چہ معنی دارد اللہ کے اذن سے انہیں سراپا زندہ کر ڈالتے تھے۔

یہ عجیب مشکل ہے کہ اگر تین زندگیاں تسلیم کریں تب بھی ایمان غارت ہو جائے اور نہ تسلیم کریں تب بھی۔ تسلیم کرنے کی صورت میں ایمان کے غارت ہونے کی تصریح تو آپ نے خود کردی ہے۔ اور نہ تسلیم کرنے کی صورت میں اس لئے ایمان غارت ہو جائے گا کہ اس صورت میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا تصریحات کو غلط ماننا پڑے گا اور ان کا انکار کرنا ہوگا۔ اور قرآن کے انکار کے بعد ایمان باقی رہ جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

اب آپ ہی بتائیے کہ اس تضاد کا کیا حل نکالا جائے؟ کیا (نعوذ باللہ) قرآن میں تضاد تسلیم کیا جائے؟ اور اس کے بیانات کو غلط قرار دیا جائے؟ یا پھر آپ نے قرآن کی پیش کردہ آیات کا جو مطلب سمجھا یا سمجھانا چاہا ہے اسے باطل اور غلط مانا جائے؟

من نگویم کہ ایں مکن آں کن
مصلحت بین وکار آساں کن

جناب عالی! یہ ساری خرابی اس لئے لازم آرہی ہے کہ آپ نے آیت ﴿ ثُمَّ اَنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُوْنَ﴾ کے ترجمہ میں لفظ ہی کا اضافہ کردیا ہے۔ اور قیامت کے دن کی بعثت کا غلط مفہوم اپنے ذہن میں جمالیا ہے۔ قیامت کے دن کی بعثت کا تصور کرنا ہو تو مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمالیجئے۔

﴿ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ﴾ (۵۱:۳۶)

اور صور پھونکا جائے گا کہ لوگ اچانک قبروں سے نکل کر اپنے رب کی طرف دوڑ رہے ہوں گے۔

﴿ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ﴾ (سورہ قمر ۶۔۷)

تو آپ ان سے رخ پھیر لیں جس دن بلانے والا ایک ناگوار چیز کی طرف بلائے گا۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوں گی۔ قبروں سے وہ اس طرح نکلیں گے جیسے پھیلی ہوئی ٹڈی ہوں۔

﴿يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ﴾

(سورہ معارج:۴۳)

جس دن یہ قبروں سے اس طرح دوڑتے ہوئے نکلیں گے گویا استھانوں کی طرف بھاگے جارہے ہیں۔

یہ اور اس طرح کی بہت ساری آیات سے روز قیامت کی بعثت کا جو نقشہ ذہن میں آتا ہے اس میں دو باتیں خاص طور پر نشاندہی کے لائق ہیں۔ ایک یہ کہ یہ بعثت عامہ ہوگی، یعنی سارے کے سارے انسان زندہ کئے جائیں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ زمین کی تہہ یا جس جگہ بھی ان کے اجزاء ہونگے وہاں سے انسانی ڈھانچہ نکال کر سطح زمین پر لا کھڑے کئے جائیں گے۔ پھر وہ چلتے پھرتے دوڑتے دھوپتے انسان ہونگے۔

بیشک قرآن مجید میں دنیاوی زندگی کے خاتمے کے بعد قیامت سے پہلے اس طرح کی بعثت عامہ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ اور نہ کوئی مسلمان اس طرح کا عقیدہ رکھتا ہے کہ قیامت سے پہلے ایسی کوئی بعثت عامہ ہوگی۔ لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا ہے کہ قیامت سے پہلے جسمانی ڈھانچہ کے ساتھ مردے کو زندہ کر کے سطح زمین پر لا کھڑا کرنے اور چلتا پھرتا ہوا انسان بنا دینے کے دو چار واقعات بھی نہیں پیش آسکتے۔ اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ مردے کو جسمانی ڈھانچے کیساتھ زندہ کئے بغیر اسے کسی بھی قسم اور کسی بھی درجے میں کوئی احساس زندگی عطا نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ قرآنی آیات اور بیانات کا واضح اور صریح تقاضا ہے کہ اہل قبور کے لئے دنیا کی معروف زندگی اور موت کی معروف بے حسی کے درمیان کسی نہ کسی درجے کا احساس زندگی تسلیم کیا جائے۔

قرآن کی وہ آیات اور بیانات بھی ملاحظہ فرمالیں:

(۱) سورۂ یٰسین میں بتلایا گیا ہے کہ نفخ صور کے بعد جب کفار اپنی قبروں سے نکلیں گے تو کہیں گے ﴿يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ (۵۲) وائے ہماری تباہی ہمیں ہماری خوابگاہ سے کس نے اٹھادیا؟ اس میں قبر کو مرقد کہا گیا ہے جو رقود سے بنا ہے۔ رقود نیند کو اور مرقد سونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قبر میں مردے کی کیفیت تقریباً اسی ڈھنگ کی ہوتی ہے جیسی سونے والے کی کیفیت ہوتی ہے کہ نہ تو اس پر موت کی مکمل بے حسی طاری رہتی ہے اور نہ اسے چلتی پھرتی زندگی کا پورا احساس ہی حاصل ہوتا ہے۔

(۲) قرآن مجید میں شہید کی بابت ارشاد ہے۔ ﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ (بقرہ) اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے والوں کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم لوگ نہیں سمجھ سکتے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ. فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (آل عمران ۱۶۹۔۱۷۱)

یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ہیں انھیں مردہ نہ سمجھو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق دیئے جاتے ہیں۔ جو کچھ انھیں اللہ نے اپنے فضل سے دیا ہے اس سے یہ خوش ہیں۔ اور جو لوگ ابھی ان کے پیچھے ہیں (یعنی دنیا میں ہیں اور) ان سے ملے نہیں ہیں۔ ان کے بارے میں خوش ہیں کہ ان پر بھی کوئی خوف نہیں، اور نہ وہ غمگین ہونگے۔ وہ اللہ

کی نعمت سے خوش ہیں۔ (اور اس پر خوش ہیں کہ) اللہ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

ان آیات سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ شہدائے کرام کو اللہ کی راہ میں قتل کئے جانے کے بعد زندگی عطا کر دی جاتی ہے لیکن یہ زندگی ہماری دنیاوی زندگی کی طرح نہیں ہوتی بلکہ ایسی ہوتی ہے جسے ہم سمجھ نہیں سکتے۔ مرحلہ شہادت سے گزرنے کے بعد ان کے لئے زندگی کا حصول اس قدر موکد طور پر یقینی اور قطعی ہے کہ انھیں مردہ کہنے سے روک دیا گیا ہے۔

پھر ان آیات سے ان کے لئے صرف زندگی ہی کا عطا کیا جانا ثابت نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہائے گونا گوں سے بہرور اور سرفراز کیا جانا بھی ثابت ہوتا ہے۔

پھر وہ اسی طرح کی نعمتوں کی خوشخبری اپنے بھائیوں کے حق میں جانتے ہیں جو ابھی دنیا سے گذرے نہیں ہیں اور انھیں اس سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے کہ ان نعمتوں کا سبب ایمان ہے۔ کیونکہ آیت کے آخر میں وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ کہا گیا ہے اَجْرُ الشُّهَدَاءِ یا اَجْرُ الْمَقْتُولِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ نہیں کہا گیا ہے۔

کہئے جناب! کیا ان آیات کے ہوتے ہوئے بھی آپ صالح اہل قبور کو ثواب اور نعمت دئے جانے کا انکار کریں گے؟ درآنحالیکہ آپ کو مکمل تاریخی شہادتوں سے معلوم ہوگا کہ شہدائے احد...... جن کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئی ہیں...... آج بھی اپنی قبروں میں آرام فرما ہیں۔ یعنی وہ بھی اہل قبور ہیں۔

ہاں! یہ بھی ارشاد فرمائیے کہ ان شہداء کے لئے دنیا اور آخرت کے درمیان کی یہ ''تیسری زندگی'' تسلیم کرنے والے مومن رہیں گے یا نہیں؟ اگر رہیں گے تو ان آیات کا کیا بنے گا جن کی روشنی میں آپ نے اس ''تیسری زندگی'' کے ماننے والوں کے ایمان کی سوالیہ انداز میں نفی کی ہے؟ اور اگر وہ مومن نہیں رہیں گے تو سوال یہ ہیں کہ آیا قرآنی آیات کی

تصدیق کا نام ایمان قرار پائے گا یا ان کے انکار کا؟

(۳) شہداء کے معاملے کے بعد اب آیئے آل فرعون کے معاملے کی طرف۔ اس سلسلے میں ابھی پوری تحقیق کے ساتھ قرآن مجید سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ آل فرعون کو عالم برزخ میں عذاب ہو رہا ہے اور آپ اس کی تردید کے سلسلے میں ایک لفظ بھی ارشاد نہیں فرما سکے ہیں۔

(۴) اور اب آل فرعون کے معاملے کے بعد عام کفار کی کیفیت سنئے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ﴿ وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِیْ غَمَرَاتِ الْمَوْتِ وَالْمَلَآئِكَةُ بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ، اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ آيَاتِهِ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴾ اور اگر آپ دیکھ لیں جب کہ ظالمین موت کی سختیوں میں ہوں اور فرشتے اپنے ہاتھ بڑھائے ہوئے ہوں کہ تم اپنے نفسوں کو نکالو۔ آج تمھیں اس سبب سے ذلت کا عذاب دیا جائے گا کہ تم اللہ پر ناحق بات بولتے تھے اور اس کی آیتوں سے استکبار کرتے تھے۔

دیکھئے کتنی صراحت اور صفائی کے ساتھ کہا گیا ہے کہ کفار کو ان کی عین وفات کے وقت یہ خبر سنائی جاتی ہے کہ آج تمھیں عذاب دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ عذاب قیامت کے دن کا عذاب نہیں ہے۔ کیونکہ جس دن کسی کافر کی موت واقع ہو رہی ہے وہ دن قیامت کا دن نہیں ہے۔ درآنحالیکہ عذاب کے اسی دن آ پڑنے کی خبر دی جا رہی ہے۔ اور یہ عذاب دنیا بھی نہیں ہے کیونکہ جس وقت ان کی روح کھینچی جا رہی ہے اس وقت انھیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ آج عذاب دیا جائے گا۔ یعنی جس عذاب کے دیئے جانے کی خبر دی جا رہی ہے ابھی وہ شروع نہیں ہوا ہے۔ درآنحالیکہ روح نکالی جا رہی ہے پس یہ عذاب مرنے کے بعد اور

قیامت سے پہلے کا عذاب ہوا۔ لہٰذا یہ قطعاً عذاب برزخ ہوا۔

(۵) سورۂ طور میں اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کے خلاف اہل مکہ کی چہ میگوئیوں کا جواب دینے کے بعد فرمایا ہے۔﴿ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ، يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ، وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ انھیں چھوڑ دو یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے دو چار ہوں جس میں وہ بیہوش کر دیئے جائیں گے۔ جس دن ان کا داؤ کچھ کام نہ دے سکے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی، اور یقیناً ظالموں کے لئے اس کے علاوہ بھی عذاب ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر لوگ نہیں جانتے۔

بتایئے ظالمین مکہ کیلئے قیامت کے دن کے علاوہ جو عذاب ہے اس سے کون سا عذاب مراد ہوسکتا ہے جبکہ تاریخی شہادتوں سے یہ بات معلوم ہے کہ ان میں سے بہت سے افراد اس دنیا سے عذاب پائے بغیر گزر گئے تھے۔ لہٰذا اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ آپ عذاب برزخ تسلیم کریں۔

(۶) سورۂ توبہ آیت نمبر ۱۰۱ میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے۔﴿ سَنُعَذِّبُهُمْ مَّرَّتَيْنِ ثُمَّ يُرَدُّوْنَ اِلٰى عَذَابٍ عَظِيْمٍ﴾ ہم انھیں دوبار عذاب دیں گے، پھر وہ بڑے عذاب کی طرف پلٹائے جائیں گے۔

اس آیت میں جس بڑے عذاب کا ذکر ہے وہ قیامت کا عذاب ہے۔ اور اس سے پہلے جو دو مرتبہ عذاب دیا جائے گا ان میں پہلی مرتبہ کا عذاب تو دنیا کا عذاب ہوا جو ان کی منافقت کا پول کھلنے یا اسی قسم کی کسی اور سزا کی شکل میں تھا۔ لیکن دوسری مرتبہ کا عذاب اگر قبر کا عذاب نہیں ہے تو پھر کونسا عذاب ہے؟ اس کی وضاحت فرما دیجئے۔

کیونکہ منافقین میں سے کسی کو بھی دنیا میں دو مرتبہ عذاب دیا جانا ثابت نہیں۔

اب فرمائیے! کیا ان آیات کی روشنی میں اس حقیقت اور عقیدہ کے ثابت اور صحیح ہونے میں کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے کہ اللہ صالح اہل قبور کو اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے اور بدعمل اور گمراہ اہل قبور کو عذاب اور سزا دیتا ہے! یعنی عذاب قبر اور ثواب قبر کا عقیدہ یا دوسرے لفظوں میں عالم برزخ میں مردوں کو عذاب یا ثواب دیئے جانے کا عقیدہ بالکل صحیح اور برحق ہے۔اس کا انکار صاف طور پر قرآن کا انکار ہے۔

قیامت سے پہلے کا عذاب وثواب قیامت کے منافی نہیں:

عذاب قبر کے انکار کے سلسلے میں آپ نے اپنی تحریر میں ایک نکتہ اٹھایا ہے۔ضروری ہے کہ اس کی بھی حقیقت واشگاف کردی جائے۔آپ نے لکھا ہے کہ:

قیامت میں آخر مردوں کو زندہ کرنے کا مقصد بھی تو یہی ہے تاکہ ہر شخص کو اسکے اعمال کا بدلہ دیا جائے......

اور آخر میں لکھا ہے کہ: اب قبر ہی میں زندگی ہے اور عذاب وثواب کا سلسلہ جاری ہے تو قیام قیامت اور جنت وجہنم وغیرہ سب سے انکار ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر واقعی قبر کی زندگی اور عذاب وثواب تسلیم کر لینے سے قیامت اور جنت وجہنم وغیرہ سب کا انکار ہو جاتا ہے تو آپ ہی بتایئے کہ آخر قرآن نے ہمیں دو ایسے متضاد عقیدوں کو تسلیم کرنے کا مکلّف کیوں قرار دیا ہے؟ (قرآن سے قبر کی زندگی اور عذاب وثواب کا ثبوت ابھی گزر چکا ہے)۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر قیامت کے دن لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیئے جانے کا تقاضا یہ ہے کہ قیامت سے پہلے اعمال پر کسی طرح کا بدلہ نہ دیا جائے ورنہ قیامت اور جنت وجہنم وغیرہ کا انکار ہوگا تو پھر اللہ تعالیٰ نے بہت ساری قوموں کو قیامت سے پہلے ہی ان کی بداعمالیوں کی سزا کیوں دے دی؟ اللہ تعالیٰ قوم سبا کی تباہی کا ذکر کر کے فرماتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِمَا كَفَرُوْا وَهَلْ نُجَازِيْ اِلَّا الْكَفُوْرَ﴾ (سورۂ سبا آیت:۱۷)

یعنی ہم نے انھیں ان کے کفر کا یہ بدلہ دیا اور ہم کفر کرنے والوں ہی کو (ایسا) بدلہ دیتے ہیں۔

بنو اسرائیل کے ایک گروہ کو ان کی بدعملی کی پاداش میں بندر اور سور بنا دیا گیا تھا۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ، فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ (بقرہ آیت:٦٥۔٦٦)

تم جانتے ہو کہ تم میں سے جن لوگوں نے سنیچر (ہفتہ) کے دن میں حد سے تجاوز کیا ہم نے ان سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ۔ تو ہم نے اس (سزا) کو اس کے سامنے اور پیچھے والوں کے لئے عبرت اور متقیوں کے لئے ذریعہ نصیحت بنا دیا۔ اور

﴿ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾ (سورۂ مائدہ:٦٠)

یعنی اللہ نے ان میں سے سور اور بندر بنا دیئے۔

بنی اسرائیل کے ایک اور گروہ پر کسی اور عذاب کے نازل کئے جانے کا ذکر بھی قرآن میں آیا ہے۔

﴿ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ﴾ (بقرہ)

ان میں سے جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ان پر ہم نے آسمان سے عذاب اتار دیا اس سبب سے کہ وہ فسق کرتے تھے۔

قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم مدین، اصحاب الایکہ، قوم لوط، قوم فرعون وغیرہ کا جو انجام ہوا وہ چار دانگ عالم میں شہرت رکھتا ہے۔ قرآن کا ہر پڑھنے والا یہ بھی جانتا ہے کہ

ان کا یہ انجام ان کے کفر و تکذیب کی سزا اور عذاب کے طور پر ہوا تھا اگر آپ کو تسلیم نہ ہو تو قرآنی آیات پیش کروں۔

سوال یہ ہے کہ کیا اللہ نے ان قوموں کو سزائیں دے کر آپ کے خیال اور دعویٰ کے مطابق خود ہی قیامت اور جنت و جہنم کے انکار کا دروازہ نہیں کھول دیا ہے؟ حیرت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو قیامت سے پہلے ثواب اور عذاب دیئے جانے کو اپنے اصول و قوانین کا ایک جزو بتلایا ہے، اور آپ اسے قیامت کے انکار کے ہم معنی قرار دے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد سنیئے۔ اس نے مکذبین کی تباہی کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِّنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾ (اعراف آیت ۹۶)

اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتیں کھول دیتے اور لیکن ان لوگوں نے تکذیب کی تو ہم نے ان کی پکڑ کی اس چیز کے سبب سے جس کو وہ کرتے تھے۔ ایک دوسری جگہ ہے۔

﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (السجدہ آیت ۲۱)

اور ہم یقیناً انھیں قریبی عذاب سے چکھائیں گے عذاب اکبر کے علاوہ تاکہ وہ لوگ رجوع کریں۔

خلاصہ یہ کہ قیامت سے پہلے لوگوں کو ان کے اعمال کا اچھا یا برا بدلہ دیا جانا قرآن مجید کی بہت ساری آیات سے ثابت ہے۔ اگر دنیا کی اس زندگی میں لوگوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دیئے جانے کے باوجود قیامت اور جنت و جہنم وغیرہ کے برحق ہونے میں کوئی خلل نہیں پڑتا اور نہ ان کا انکار لازم آتا ہے تو قبر میں عذاب و ثواب کا سلسلہ جاری رہنے سے قیامت اور جنت و جہنم وغیرہ کے برحق ہونے میں کیوں ان کا انکار لازم آئے گا؟

ایک سوال یہ بھی حل فرماتے چلئے کہ اگر قیامت سے پہلے جزاء وسزا تسلیم کر لینے سے قیامت اور جنت وجہنم کا انکار لازم آتا ہے تو پھر قرآن نے مجرموں کو سزا دینے کا حکم کیوں دیا ہے؟ چور کا ہاتھ کاٹنے، زانی اور زنا کی تہمت لگانے والے کو کوڑے مارنے، قاتل سے قصاص یا دیت لینے، باغیوں کو عبرتناک طور پر قتل کر دینے یا جلاوطن کر دینے وغیرہ کے احکامات تو خود قرآن مجید میں موجود ہیں۔ کیا قرآن دنیا میں ان سزاؤں کے نفاذ کا حکم دے کر اپنے قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتا کہ سزا کا وقت قیامت کا دن ہے۔

آپ نے عقیدۂ عذاب قبر پر بحث کے دوران ''تحقیقات کا جو سرمایہ'' اکٹھا فرمایا تھا اس کا ہم نے بقدر ضرورت جائزہ لے لیا ہے، اور افسوس ہے کہ وہ اختصار کی کوشش کے باوجود کسی قدر طویل ہو گیا ہے۔ ابھی ہم نے کئی گوشے تشنہ چھوڑ دیئے ہیں۔ اگر آئندہ ضرورت محسوس ہوئی تو انھیں بھی نمایاں کیا جائے گا۔

اس بحث سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ منکرین حدیث قرآن فہمی کے سلسلے میں قطعی بودے اور اناڑی ہیں۔ یہ بیچارے جب بھی قرآن فہمی کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے سامنے بحث کا ایک پہلو آتا ہے۔ اور دوسرے کئی پہلو نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ اور اسی لئے وہ جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ نتیجہ خود قرآن ہی کی دیگر تصریحات سے ٹکرا جاتا ہے۔ آپ کو یقین نہ ہو تو پچھلے صفحات میں دیکھ لیجئے کہ کس طرح آپ کی ہر تحقیق جو آپ نے قرآن کی روشنی میں لکھی ہے خود قرآن ہی کے مخالف ہے۔

نماز پنجگانہ اور منکرین حدیث:

منکرین حدیث نمازوں کے مسئلہ کو بھی کئی قسم کے شبہات پھیلانے کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں، کہتے ہیں کہ حدیث کے ماننے والوں کے درمیان نماز پڑھنے کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ اگر حدیثیں صحیح اور قابل اعتبار ہوتیں تو یہ اختلاف کیوں ہوتا۔۔۔۔ جواب

یہ ہے کہ حدیث کے ماننے والوں میں بلکہ اسلام کے تمام فرقوں میں نماز کے ارکان کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں۔ دنیا بھر کے شیعہ، سنی، خارجی، رافضی، حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، اہلحدیث، دیوبندی، بریلوی، غرض اسلام کے تمام فرقے کہتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے میں پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں۔ سب کے سب یہ بھی مانتے ہیں کہ فجر میں دو رکعت، ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعت اور مغرب میں تین رکعت فرض ہے۔ نماز کے طریقے میں بھی سب کا اتفاق ہے۔ یعنی سب مانتے ہیں کہ پہلے قیام پھر رکوع، پھر قومہ، پھر دو سجدے کریں گے تب ایک رکعت پوری ہوگی۔ پھر دو رکعت پر تشہد کریں گے۔ پھر اخیر میں تشہد کر کے سلام پھیریں گے۔ سب اس پر بھی متفق ہیں کہ سورہ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے۔ اختلاف صرف اتنا سا ہے کہ جماعت کی صورت میں امام کی قراءت ہی سب مقتدیوں کی قراءت کے لئے کافی ہے یا ان کو الگ سے قراءت کرنی ہوگی۔ گویا سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل سبھی ہیں۔ صرف پڑھنے کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ سو یہ کوئی اہم اختلاف نہ ہوا۔ اسی طرح رفع یدین کرنے کے بارے میں صرف یہ اختلاف ہے کہ افضل کیا ہے۔ کوئی شخص (تحقیق کرنے کے بعد) رفع یدین کے ساتھ نماز پڑھے یا بغیر رفع یدین کے۔ نماز سب کے نزدیک صحیح ہوگی۔ پس درحقیقت نماز کے ارکان اور بنیادی مسائل میں حدیث کے ماننے والوں کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ ہاں جو لوگ حدیث کا انکار کرتے ہیں۔ صرف قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں ان کے درمیان البتہ نہایت ہی سخت، زبردست اور بنیادی اختلاف ہے۔ سنو اور غور سے سنو!

(۱) منکرین حدیث کے سب سے بڑے گرو مولوی عبداللہ چکڑالوی کا مذہب یہ ہے کہ نمازیں، پانچ وقت کی فرض ہیں (دیکھو چکڑالوی صاحب کی تفسیر القرآن جلد اول (ص:۱۱۲) اور صلوٰۃ القرآن (ص ۸) اسی طرح حافظ اسلم صاحب جیراجپوری بھی پانچ وقت کی نمازیں فرض مانتے ہیں۔ اسے دین کہتے ہیں۔ اور اس کی مخالفت کو

قرآن کی مخالفت قرار دیتے ہیں۔ (دیکھو تعلیمات حصہ اول ص ۵۶)

(۲) ان دونوں یعنی مولوی عبداللہ چکڑالوی اور حافظ اسلم جیراجپوری کے برخلاف منکرین حدیث کے دو اور سرکردہ ہیں جن میں سے ایک صاحب بلاغ القرآن کے ایڈیٹر، اور دوسرے صاحب لاہوتی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قرآن سے صراحت کے ساتھ پانچ وقت کی نماز کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن ہم پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ (دیکھو بلاغ القرآن ماہ جون ۱۹۶۷ء ص ۱۷ اور طلوع اسلام اگست ۱۹۵۰ء ص ۶۰۔۶۱)۔

(۳) ان دونوں گروہوں کے برخلاف منکرین حدیث کی ایک پارٹی گوجرانوالہ (پاکستان) میں ہے۔ اور ایک پارٹی بدایوں (یوپی ہندستان) میں ہے۔ یہ دونوں پارٹیاں تین وقت کی نمازیں فرض مانتی ہیں [دیکھو رسالہ اقیموا الصلوٰۃ ص ۲۱] پھر تین وقت ماننے والوں میں بھی سخت اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ ظہر اور مغرب فرض ہے۔ عصر اور عشاء کی نمازیں غلط ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ عصر اور عشاء فرض ہے ظہر اور مغرب کی نمازیں غلط ہیں۔

(۴) ان تینوں سے الگ تھلگ منکرین حدیث کا ایک چوتھا گروپ ہے جس کے سربراہ خواجہ عباد اللہ اختر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نماز دو ہی وقت کی فرض ہے۔

(۵) اور ان سب سے نرالے مدھوپوری منکرین حدیث ہیں، جو چھ وقت کی نمازیں فرض مانتے ہیں۔

(۶) منکرین حدیث کا یہ اختلاف تو نماز کے اوقات کے بارے میں تھا۔ اب ذرا نماز کی رکعات کی تعداد اور نماز کے طریقے کے متعلق ان کا اختلاف سنئے! مولوی عبداللہ چکڑالوی، اسلم صاحب جیراجپوری، اور بلاغ القرآن کے ایڈیٹر اور لاہوتی صاحبان کہتے ہیں کہ نمازوں کی رکعات کی تعداد، نماز پڑھنے کا طریقہ دعا اور اوراد و وظائف

سب کچھ وہی جو حدیث کے ماننے والوں کے نزدیک ہیں [پچھلے حوالوں میں دیکھو] تین وقت کی نماز ماننے والے کہتے ہیں کہ ہر نماز میں صرف دو ہی رکعتیں ہیں۔ پھر ان میں سے کچھ کہتے ہیں کہ ہر رکعت میں دو سجدے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ ایک ہی سجدہ ہے۔ اسی طرح ان لوگوں نے قرآن کی مختلف آیتوں کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر اپنی طبیعت سے دعاؤں کا ایک مجموعہ گھڑ لیا ہے۔ اور نماز کے مختلف حصوں یعنی قیام' رکوع' سجدہ وغیرہ کے لئے ایک ایک ٹکڑا کسی دلیل کے بغیر مقرر کر لیا ہے۔

(۷) ان سب سے الگ تھلگ منکرین حدیث کے سب سے بڑے گرو غلام احمد پرویز کی منطق ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ نماز' حج' زکوٰۃ سب فضول چیزیں ہیں۔ اور اسلام کی ذلت و رسوائی اور پستی کا سبب ہیں [دیکھو طلوع اسلام مارچ ۱۹۵۳ء ص ۴۶] بلکہ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر پرویز صاحب نے نماز کو ایران کے آگ پوجنے والے مجوسیوں کی رسم کا عکس قرار دیا ہے [دیکھو طلوع اسلام دسمبر ۱۹۵۱ء ص ۴۷]۔

خلاصہ یہ کہ جو لوگ اہل قرآن ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے درمیان نماز کی رکعات' کیفیت' ترکیب وغیرہ میں ایسا زبردست اختلاف ہے کہ ان پر نو برہمن اور گیارہ چولہے والی مثل پورے طور پر صادق آتی ہے۔

ایک طرف منکرین حدیث کا یہ ہنگامہ خیز اختلاف سامنے رکھئے۔ اور دوسری طرف ایک منکر حدیث صاحب کی ترنگ سنیئے! بطور اعتراض ارشاد ہے۔

''حضرت جبریل علیہ السلام آتے ہیں۔ نماز پڑھ کر دکھلاتے ہیں' انھوں نے نماز کہاں سے سیکھی؟ خدا نے کر کے دکھلایا ہوگا۔ پھر نماز کے اندر بار بار اختلاف کی بھرمار۔ کبھی نیت کبھی ہاتھ باندھنے کے متعلق علی صدرہ اور کہیں تحت السرۃ' آمین بالجہر' رفع یدین' فاتحہ خلف الامام وغیرہ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کیا نبی کریم ﷺ پچاسوں قسم کی نماز رنگ برنگ پڑھتے ہوں گے؟ ان ہی ملاؤں نے مذہب اسلام کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اوراپنی

الگ الگ ٹولی ایک اینٹ کی الگ مسجد بنا ڈالی ہے۔"

جی ہاں! اگر حضرت جبریل حضور ﷺ کو نماز پڑھ کر اسی صورت میں دکھلا سکتے ہیں کہ انہیں اللہ نے کر کے دکھائی ہو تو پھر یاد رہے کہ قرآن مجید میں سورۂ توبہ میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ جنگ بدر میں فرشتے کفار کی گردنیں اور ان کے پوروں (جوڑوں پر بنوٹ کی مار) مارنے پر مامور تھے۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے یہ کام کہاں سے سیکھا؟ آپ کے اصول کے مطابق اللہ نے لٹھ گھما گھما کر اور تلوار چلا چلا کر مارنے اور کاٹنے کا ڈھنگ سکھایا ہوگا؟ اگر نہیں تو پھر جو جواب آپ دیں گے وہی جواب ہماری طرف سے بھی ہوگا۔

باقی رہا نماز کے بعض جزوی اور فروعی مسائل میں ہمارے درمیان بالکل معمولی اور ناقابل ذکر قسم کا اختلاف تو ایسے اختلاف کو اچھالنا اور اسے پچاسوں قسم کی "رنگ برنگ" نماز سے تعبیر کرنا منکرین حدیث کی فطرت کی کجی کی علامت ہے۔ دنیا کا کوئی انسان جو سمجھ بوجھ اور فطرت کی سلامت روی سے محروم نہ ہو اس بات سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا کہ نبی کریم ﷺ نے تیئیس سالہ پیغمبرانہ زندگی میں اگر گنجائش اور بیان جواز کے لئے نماز کے بعض عمل کی دو دو صورتیں اختیار کی ہوں تو یہ کوئی بعید بات نہیں بلکہ عین ممکن ہے۔ خود قرآن مجید میں قسم کے کفارے کی تین تین صورتیں رکھی گئی ہیں۔ کفارۂ ظہار کیلئے بھی تین صورتیں رکھی گئی ہیں۔ نماز تہجد کیلئے تین اختیاری اوقات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حاجی کیلئے یوم النحر (دس ذی الحجہ) کے بعد منیٰ میں دو دن ٹھہرنا بھی درست قرار دیا گیا ہے۔ اور تین دن ٹھہرنا بھی۔ پس اگر ایک عمل کیلئے ایک سے زیادہ صورتوں کا جواز کوئی قابل اعتراض بات ہے تو قرآن کے بیان کئے ہوئے ان مسائل کی بابت کیا ارشاد ہے؟ اور اگر قابل اعتراض نہیں تو پھر ہماری نماز کے ان معمولی اور ناقابل ذکر اختلافات کو اچھال کر اس پر جملہ بازی کرنا اگر فطرت کی کجی کی علامت نہیں تو پھر اسے علم و دیانت کے کس خانہ میں شمار کیا جاسکتا ہے۔؟

اور پھر ہماری نمازوں کا اس قدر معمولی اختلاف ذکر کرتے ہوئے تو منکرین حدیث

کو شرم آنی چاہیے۔ حیرت ہے کہ خود ان کے اپنے گھر میں اس نماز کے متعلق بنیادی اختلافات کا جو ہنگامہ خیز طوفان بد تمیزی برپا ہے وہ انھیں کیوں نظر نہیں آتا؟ کیا ان کے اس اختلاف سے دین اسلام پارہ پارہ نہیں ہوتا؟ اور ایک ایک اینٹ کی الگ مسجد تعمیر نہیں ہوتی؟ انھیں کیوں اپنے پیشواؤں سے یہ پوچھنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ کیا اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ایسی ہی پچاسوں قسم کی ''رنگ برنگ'' نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ جس کی نشاندہی آپ لوگ فرما رہے ہیں؟ حیرت ہے کہ انھیں اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔ اور ہماری آنکھ میں تنکے تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔

نماز کے متعلق ابتدائے رسالہ میں دوسرے سوال کے تحت ہم نے جن تفصیلات کے بارے میں کہا ہے کہ انھیں قرآن سے دکھلاؤ پھر اسی نماز کے بارے میں منکرین حدیث کا جو طوفانی اختلاف ہم نے ابھی پچھلے صفحات میں پیش کیا ہے جب سے یہ دونوں باتیں منکرین حدیث کے سامنے آئی ہیں ان کی صفوں میں کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ ان کے لئے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ لوگ نہ تو اپنا دعویٰ ہی ثابت کر سکتے ہیں اور نہ حقیقت کا اقرار ہی کرنے کیلئے تیار ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنی آبرو بچانے کے لئے عجیب بہکی باتیں بول رہے ہیں۔ ایک صاحب نے ہمارے پاس ایک طولانی تقریر بھیجی ہے۔ اتنی طولانی کہ پڑھ کر بے ساختہ منہ سے نکلا۔ ؎

ملے تو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طول مدعا کیلئے

اس پوری تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو ملت ابراہیمی کی پیروی کا حکم دیا ہے۔ اور اس ملت پر نماز فرض تھی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ اے رب! مجھے اور میری ذریت میں سے لوگوں کو نماز قائم کرنے والا بنا۔ ان کی دعا قبول کی گئی۔ دعا کے مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت تک ان کی ملت میں نماز

قائم کرنے والے موجود رہے ہوں۔ پس ملت ابراہیمی کے تعامل سے حضور ﷺ کی بعثت تک نماز کی جو صورت قائم چلی آ رہی تھی وہی صورت آنحضور ﷺ نے قائم رکھی۔ یہ نہیں کہ حضرت جبریل کے ذریعہ نماز کی صورت سکھائی گئی۔

آیئے! اس تقریر کے بھی اس ''نکتہ'' کا جائزہ لیتے چلیں۔ یہ معلوم ہے کہ حضور ﷺ کی بعثت کے وقت تین گروہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ ایک مشرکین عرب، دوسرے یہود اور تیسرے نصاریٰ۔ مشرکین کی نماز اللہ کے نزدیک کس قدر لائق توجہ تھی اس کا اندازہ قرآن کے اس بیان سے ہوسکتا ہے کہ۔

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاءً وَّتَصْدِيَةً ﴾

ان کی نماز بیت اللہ کے پاس محض شور مچانا اور سیٹی بجانا ہے۔

اہل کتاب نے:

(۱) **اولاً**: تو عام طور پر نماز ہی ضائع کر دی تھی (دیکھئے سورہ مریم آیت ۵۹)

(۲) **ثانیاً**: ان کے درمیان نماز کے اوصاف کے بارے میں خود ہی سخت اختلاف برپا تھا۔ جن میں سے بعض اختلافات کی نشاندہی خود قرآن نے کی ہے۔ اور آنحضور ﷺ کو نہ صرف ان کی پیروی سے منع کیا ہے بلکہ ان کے اس طرز عمل کو ان کی خواہش نفس قرار دیتے ہوئے ان کی پیروی کو ظلم قرار دیا ہے (دیکھئے سورہ بقرہ آیت ۱۴۵)

بتایئے جب نہ مشرکین کی نماز لائق اعتناء ٹھہری نہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کی نماز کی پیروی درست قرار دی گئی۔ تو اب ملت ابراہیمی کا کون سا گروہ باقی بچتا ہے جس کی پیروی کا حضور ﷺ کو مکلف قرار دیا گیا؟ اور جس سے حضور ﷺ نے نماز سیکھی؟

(۳) **ثالثاً**: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی ذریت میں نماز قائم کرنے والے لوگوں کے وجود کی جو دعا کی تھی اس سے یہ نتیجہ نکالنا قطعی غلط ہے کہ آنحضور ﷺ کے زمانے میں بھی ابراہیمی نماز ٹھیک قائم اور موجود تھی۔ اگر ان کی دعا کے قبول ہونے کا

یہی مطلب ہے تو انھوں نے تو یہ دعا بھی کی تھی کہ:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُسْلِمَةً لَكَ ﴾ (سورہ بقرہ ۱۲۸)

اے ہمارے رب! تو ہمیں اپنا تابعدار (مسلمان) بنا۔ اور ہماری ذریت میں سے بھی اپنی ایک امت مسلمہ بنا۔

منکرین حدیث کے اصول کے مطابق ضروری ہے کہ ان کی اس دعا کے نتیجے میں آنحضور ﷺ کی بعثت کے وقت بھی ایک امت مسلمہ موجود رہی ہو۔ ورنہ لازم آئے گا کہ ان کی دعا ہی مقبول نہ ہوئی۔ سوال یہ ہے کہ پھر آنحضور ﷺ کو بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ یہی امت مسلمہ کافی تھی دعوت و تبلیغ اور دین اسلام کو برپا کرنے کا کام کرتی رہتی۔ اور اگر حضور ﷺ کو بھیج ہی دیا گیا تھا تو تیس پاروں کا قرآن نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اللہ تعالیٰ کو صرف اتنا کہہ کر بات ختم کر دینی چاہیے تھی کہ نماز کی طرح دوسرے تمام شعبہائے زندگی میں بھی اسی امت مسلمہ کی پیروی کیجئے!

(۴) **رابعاً:** اگر حضور کی بعثت کے وقت اکا دکا افراد صحیح معنوں میں نماز قائم کرنے والے رہے بھی ہوں تو اس کا کیا ثبوت ہے کہ حضور ﷺ نے انھیں پایا بھی تھا؟ اور اگر پایا بھی ہو تو پھر اس کا کیا ثبوت ہے کہ حضور ﷺ نے ان کا طریقہ عمل اختیار بھی کیا تھا؟

(۵) **خامساً:** اگر کسی بھی درجہ میں یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ آنحضور ﷺ نے اپنی نماز اہل کتاب سے سیکھی تھی تو یہ بات تو بہر حال متعین ہے کہ حضور ﷺ نے جو نماز خود اختیار کی تھی وہی نماز اپنی امت کو بھی سکھائی تھی۔ سوال یہ ہے کہ پھر یہود و نصاریٰ کی نماز میں اور اس امت مسلمہ کی نماز میں اس قدر زبردست اور بنیادی اختلافات کیوں ہیں کہ یہود و نصاریٰ کی نمازیں اور اس امت مسلمہ کی نمازیں بالکل ہی جدا جدا نوعیت کی ہیں حتیٰ کہ انھیں دیکھ کر ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ یہ دو امتوں کی نمازیں ہیں۔

(٦) **سادساً**: یہ بات بھی متعین ہے کہ حضور ﷺ نے جو نماز پڑھی اور اپنی امت کو سکھلائی اس کی کوئی نہ کوئی شکل وصورت اور کوئی نہ کوئی ڈھنگ اور طریقہ ضرور تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہ شکل باقی رہ گئی ہے یا نہیں؟ اگر باقی رہ گئی ہے تو وہ کونسی شکل ہے؟ آیا وہ شکل جو معمولی سے اختلاف کیساتھ حدیث کے ماننے والوں کے درمیان چودہ سو برس سے رائج ہے؟ یا بے سر پیر کی وہ رنگا رنگ شکلیں جنھیں چند برسوں سے منکرین حدیث نے ایجاد کر رکھا ہے؟ حدیث کو نہ مانتے ہوئے آخر ہم حضور ﷺ کی نماز، ملت ابراہیمی کی نماز یا امت مسلمہ کی نماز کی صحیح شکل وصورت کیسے معلوم کر سکتے ہیں؟ اسے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟

(٧) **سابعاً**: اگر نماز کی وہ شکل صحیح تسلیم نہیں کی جاتی جو احادیث پر مبنی ہے تو اس کا لازمی معنی یہ ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے تھوڑے ہی عرصہ بعد نماز کی صحیح شکل وصورت کا خاتمہ ہو گیا۔ اور چودہ سو برس یا کم از کم تیرہ سو برس کا عرصہ اس امت پر ایسا گذرا کہ اسے اپنی نماز کے بگڑ جانے کی سن گن تک نہ لگ سکی، کوئی تیرہ سو برس کے بعد اچانک کچھ لوگوں پر یہ بات منکشف ہوئی کہ یہ امت تو اب تک اصل نماز کے بجائے ایک فرضی نماز پڑھتی رہی ہے۔ پھر انھوں نے چاہا کہ اصل نماز کا پتہ لگا کر اس کا احیاء بھی کریں، اور امت کیلئے نشاندہی بھی کریں۔ لیکن وہ خود آپس میں اس بری طرح دست وگریباں ہو گئے کہ الامان والحفیظ، ہر ایک نے اندھے کی لٹھ گھمائی۔ اور ساری نماز اور تمام نمازیوں کے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دیئے۔ اب بتایئے کہ یہ امت بیچاری کرے تو کیا کرے؟

(٨) **ثامناً**: کیا یہ بات عقل میں آسکتی ہے کہ یہود ونصاریٰ جن کی دینی حیثیت قطعی طور پر مسترد کر دی گئی۔ اور جن کو گمراہ اور خدا کا غضب رسیدہ قرار دے کر ان کے طرز عمل سے بچنے کے لئے دعا کی تلقین کی گئی ان کے درمیان تو نماز اتنی صحیح شکل میں محفوظ رہ

گئی ہو کہ پیغمبر آخرالزماں ﷺ اور ان کی امت کو ان یہود و نصاریٰ سے نماز سیکھنے کا حکم دیا جائے۔ لیکن خود یہ امت مسلمہ جسے اپنی دینی حیثیت کے ساتھ نہ صرف یہ کہ قیامت تک باقی رہنا ہے، بلکہ دنیا کی امامت و قیادت بھی کرنی ہے اس امت کی نماز اپنے پیغمبر ﷺ کے وفات پاتے ہی اس طرح بگڑ گئی ہو کہ اسکی صحیح شکل وصورت اور کیفیت و نوعیت کا جاننا ہی ممکن نہ رہ گیا ہو؟

معلوم نہیں کیوں منکرین حدیث کو اپنی ان بے تکی باتوں ہی میں تک محسوس ہوتا ہے۔ اور وہ اپنی ان خرافات کو "**تدبر فی القران**" اور "**تفقه فی الدین**" سمجھ کر اس قدر شاداں وفرحاں رہتے ہیں کہ قرآن کی پیغمبرانہ شرح و تعبیر تک سے بے نیازی کا مظاہرہ کرتے پھرتے ہیں۔

اللہ رے ایسے حسن پر یہ بے نیازیاں
بندہ نواز! آپ کسی کے خدا نہیں

(۹) **تاسعاً**: منکرین حدیث شور مچاتے رہتے ہیں کہ قرآن کامل ہے۔ لہٰذا اس سے باہر کی کوئی چیز نہ لو۔ ورنہ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن کو کامل نہیں مانتے۔ سوال یہ ہے کہ پھر نماز کے تفصیلی مسائل کہاں سے لئے جائیں۔ قرآن میں یہ مسائل نہیں۔ اور یہود و نصاریٰ کا تعامل یا اس امت محمدیہ ﷺ کا تعامل قرآن سے بہر حال زائد، اس سے باہر اور "**مِثلَه مَعه**" ہے۔ اگر منکرین اس تعامل کی پیروی کے قائل ہیں۔ جیسا کہ ان کی بھیجی ہوئی تقریر سے واضح ہوتا ہے۔ تو یہ قرآن پر ایک بیرونی اضافہ ہوا۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ قرآن کو کامل نہیں مانتے۔ اور اگر وہ یہ کہیں کہ خود قرآن ہی نے ملت ابراہیمی کے تعامل کی پیروی کا حکم دیا ہے، اس لئے اس تعامل کی پیروی نہ تو قرآن میں کوئی بیرونی اضافہ ہے۔ اور نہ اس سے قرآن کے کامل ہونے میں کوئی فرق پڑتا ہے۔ تو ہم کہیں گے کہ بعینہ یہی معاملہ تو حدیث کا بھی ہے۔

حدیث میں وہی اقوال وافعال رسول بیان کئے گئے ہیں جو نبی اکرم ﷺ نے اللہ کی طرف سے عطا کئے ہوئے مناصب رسالت کی بنا پر بحیثیت پیغمبر انجام دیئے تھے یا ارشاد فرمائے تھے۔ اور جن کی اطاعت وپیروی کا دوٹوک حکم ہمیں قرآن نے دے رکھا ہے۔ اس لئے حدیث کی پیروی نہ تو قرآن میں کوئی بیرونی اضافہ ہے نہ اس سے قرآن کے کامل ہونے میں کوئی فرق پڑتا ہے۔

(۱۰) **عاشراً**: آنحضور ﷺ نے اپنے مخصوص پیغمبرانہ مناصب واختیارات کے تحت۔ جن کا بیان گذر چکا ہے۔ مخصوص عقائد واحکام کی بنیاد پر اپنے اقوال وافعال کے ذریعہ صحابہ کرام کی جو جماعت تیار کی آپ کی بعثت کے بعد یہی امت مسلمہ اور ملت ابراہیمی تھی۔ اور آپ کی قیادت میں زندگی کے تمام شعبوں کے اندر اس جماعت کا جو طرز عمل تھا وہی ملت ابراہیمی اور امت مسلمہ کا طرز عمل تھا۔ پھر ان کی متابعت میں ان کے بعد آنے والوں کے درمیان ان کے طرز عمل کا جو تسلسل قائم ہوا یہی ملت ابراہیمی کا تعامل ہے۔ اور آنحضور ﷺ کے جو اقوال وافعال اس تعامل کی بنیاد ہیں وہی اقوال وافعال احادیث کہلاتے ہیں۔ پس اگر یہ تعامل حجت اور واجب الاطاعت ہے تو خود اس تعامل کی بنیاد یعنی احادیث کیوں حجت اور واجب الاطاعت نہیں؟

پھر منکرین حدیث جب یہ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی جو نماز تھی اب وہ نماز محفوظ نہیں رہ گئی تو دوسرے لفظوں میں وہ یہ اقرار کرتے ہیں کہ ملت ابراہیمی یا امت مسلمہ کے تعامل میں خلل پڑ سکتا ہے۔ اور یہ تعامل بگڑ کر اس حد تک مسخ ہوسکتا ہے کہ آنحضور ﷺ کے زمانے کی صحیح شکل لوگوں کے درمیان باقی نہ رہ جائے۔ اور یہ بات ناقابل انکار تاریخی حقائق سے بھی ثابت ہے کہ پہلی صدی ہی میں بعض معاملات کے اندر آنحضور ﷺ کے متعین کئے ہوئے طرز عمل میں خلل واقع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور اسی کے لئے اس امت کے مخلصین کا یہ احساس شدت اختیار کر گیا کہ آنحضور ﷺ کی اس پیغمبرانہ رہنمائی کا پورا

ریکارڈ اچھی طرح چھان پھٹک کر محفوظ کر لیا جائے جن کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ اور اس کا تعامل قائم ہے۔ ورنہ بگاڑ اور فساد پھیل جانے کے بعد طالبان حق کے پاس کوئی ایسا ذریعہ اور معیار نہیں رہ جائے گا جس سے وہ صحیح اور غلط کی تمیز کر سکیں اور اس طرز عمل کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل کر سکیں جو رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرز عمل تھا۔ آپ کی پیغمبرانہ رہنمائی کا یہی ریکارڈ حدیث کے نام سے معروف ہے۔ اگر منکرین حدیث اس ریکارڈ کو صحیح تسلیم نہیں کرتے تو وہی بتلائیں کہ آج اس امت کے اختلافات کے منجدھار میں ہم بے شمار مسائل کے بارے میں کس بنیاد پر اس کی تعیین کر سکتے ہیں کہ فلاں مسئلہ میں فلاں طرز عمل آنحضور ﷺ اور آپ کی جماعت کا ہے۔ اور بقیہ طرز ہائے عمل کجروان امت کے ایجاد کردہ ہیں۔؟

پانچ وقت کی نماز قرآن سے:

منکرین حدیث کا ایک شوشہ یہ بھی ہے کہ پانچ وقت کی نماز کا ثبوت قرآن سے نہیں۔ اس سلسلہ میں کئی پہلو سے بات کی جا سکتی ہے۔ ایک تو یہ کہ جس امت نے یہ بات بیان کی ہے کہ جو قرآن ہم پڑھتے ہیں بلا کمی بیشی کے وہی قرآن آنحضور ﷺ کا لایا ہوا ہے۔ وہی امت بغیر اختلاف کے یہ بھی بیان کرتی ہے کہ آنحضور ﷺ کی نماز پانچ وقت یومیہ تھی۔ اگر دوسرا بیان قابل اعتبار نہیں تو پہلا کیوں قابل اعتبار ہے؟ اور اگر پہلا قابل اعتبار ہے تو دوسرا بھی قابل اعتبار ماننا ہوگا کیونکہ دونوں کی بنیاد ایک ہی ہے ورنہ پھر فرق کی وجہ بتلائی جائے۔

دوسرے یہ کہ منکرین حدیث یا اہل قرآن خود حیران ہیں کہ نماز کتنے وقت کی فرض مانیں۔ پانچ، تین، یا دو، یا سرے سے نماز ہی کو نہ مانیں۔ اگر قرآن میں واقعی نماز کے اوقات ٹھیک بیان کر دیئے گئے ہیں تو آپ لوگوں میں اتنا زبردست اختلاف کیوں ہے؟

تیسرے یہ کہ خود قرآن کی آیات صاف اشارہ کرتی ہیں کہ پانچ وقت کی نماز فرض

ہے۔ سنو! اور غور سے سنو!

پہلی دلیل۔ ارشاد ہے۔

﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾

نمازوں کی محافظت کرو، اور خصوصاً بیچ والی نماز کی۔

صلوات جمع ہے جو تین یا تین سے زیادہ پر بولا جاتا ہے۔ اس لئے مذکورہ آیت سے معلوم ہوا کہ بیچ والی نماز کے علاوہ تین یا تین سے زیادہ اوقات کی نماز فرض ہے۔ اب اگر بیچ والی نماز کے علاوہ باقی نمازیں تین ہی مانیں تو درمیانی نماز سمیت چار ہوں گی۔ اور چار ہونے کی صورت میں ظاہر ہے کوئی بیچ والی نہیں کہلا سکتی۔ کیونکہ دو نمازیں ایک طرف ہو جائیں گی اور دو ایک طرف۔ اس لئے ضروری ہے کہ بیچ والی نماز کے علاوہ چار نمازیں فرض ہوں۔ پس کل نمازیں پانچ ہوئیں۔

دوسری دلیل یہ ہے:

﴿وَمِنْ آنَاءِ اللَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى﴾ (۲۰:۱۳۰)

رات کے بعض حصوں میں نماز پڑھو۔ اور دن کے اطراف میں تاکہ تم راضی ہو جاؤ۔

اطراف جمع ہے جس کا استعمال کم سے کم تین پر ہوتا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے ثابت ہوا کہ دن میں کم سے کم تین نمازیں فرض ہیں۔ آناء اللیل سے پہلے لفظ من لگا ہے جو بعض کو مراد لینے کا فائدہ دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رات میں کم از کم ایک نماز تو ضروری پڑھنی ہے۔ لیکن رات کی نماز اگر ایک ہی مانیں تو دن کی تین نمازوں کو ملا کر کل چار نمازیں ہوں گی۔ پھر کوئی نماز بیچ والی نہیں رہ جائے گی۔ حالانکہ اوپر والی آیت سے ثابت ہے کہ ایک نماز بیچ والی بھی ہے اس لئے رات میں ایک نہیں دو نمازیں ماننی ہوں گی پس کل نمازیں پانچ وقت کی ہوئیں۔ تین وقت کی دن میں جو کہ اطراف النہار کے لفظ سے ثابت ہے اور دو وقت کی رات میں جو کہ من آناء اللیل کے تقاضے سے ثابت ہیں۔

تیسری دلیل یہ ہے:

﴿فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ﴾

پس اللہ کی تسبیح کرو۔ یعنی اس کیلئے نماز پڑھو جب شام کرو اور جب صبح کرو اور آسمان اور زمین میں حمد تو اللہ ہی کیلئے ہے (اور نماز پڑھو) سہ پہر کو اور ظہر کے وقت میں۔

اس آیت میں صبح وشام، سہ پہر اور دوپہر چار اوقات میں نماز پڑھنے کا حکم ہے۔ ایک آیت میں عشاء کی نماز کا صراحۃً ذکر آیا ہے۔ (وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ) لہٰذا کل پانچ وقت کی نمازیں ہوئیں۔ نیز اگر پانچ نہ مانیں تو کم از کم چار کا ذکر اس آیت میں آیا ہے اسے تو مانیں گے ہی۔ پھر یہ سوال رہ جائے گا کہ بیچ والی نماز کون سی ہوئی۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ شام کی نماز سے مغرب کی نماز مراد ہے اور عشاء کی نماز اس کے علاوہ ہے۔ دلیل یہ ہے کہ آیت میں اس کے لئے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ مساء سے بنا ہے۔ لغت عرب میں مساء کا استعمال صباح اور صبح کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ گویا سورج نکلنے سے جتنی پہلے فجر کی نماز پڑھی جاتی ہے۔ سورج ڈوبنے کے اتنے ہی وقت کے اندر اندر ایک نماز پڑھنی ہے جسے شام کی نماز کہا گیا اور یہ نماز مغرب کی نماز ہوسکتی ہے عشاء کی نماز نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عشاء کی نماز اتنی دیر سے پڑھی جاتی تھی کہ لوگ اس نماز سے فارغ ہوکر خوابگاہ میں سونے کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ اسی لئے نماز کے بعد نا کارہ قسم کے مردوں اور بچوں کو بھی اجازت کے بغیر اندر داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ سورج ڈوبنے کے تھوڑی دیر بعد دنیا میں کہیں بھی لوگ سونے کے لئے خوابگاہ میں نہیں جاتے۔ اس لئے عشاء کی نماز کا وقت شام کی نماز کے علاوہ ہوا۔ پس دن میں تین نمازیں صبح، ظہر، اور عشی یعنی سہ پہر (عصر) ثابت ہوئیں۔ اور رات میں دو نمازیں مغرب وعشاء کل پانچ نمازیں ثابت ہوئیں۔

چوتھی دلیل یہ ہے:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْکِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ اللَّیْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ ﴾

نماز قائم کرو سورج ڈھلنے کے وقت سے رات کے اندھیرے تک اور صبح کو (نماز میں) قرآن پڑھو۔

اس میں تین وقتوں کا نام بہت صاف طور سے لیا گیا ہے۔ دلوک شمس یعنی ظہر، غسق اللیل یعنی عشاء اور فجر۔ لیکن اس کا انداز بیان زیادہ غور کرنے کے لائق ہے۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ سورج ڈھلنے اور اندھیرا پھیلنے کے وقت نماز پڑھو۔ بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ سورج ڈھلنے سے رات کا اندھیرا پھیلنے تک نماز پڑھو۔ اب اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ سورج ڈھلنے کے وقت نماز کے لئے کھڑے ہو جائیں، اور اتنی لمبی نماز پڑھیں کہ رات کا اندھیرا پھیلنے کے وقت ختم ہو۔ لیکن یہ صورت اتنی کٹھن ہے کہ قوت برداشت سے باہر ہے۔ اس لئے یہ صورت مراد نہیں ہو سکتی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ سورج ڈھلنے اور اندھیرا پھیلنے کے بیچ میں بھی کچھ نمازیں مانی جائیں جن کے ملا دینے سے ایک طرح کا سلسلہ جڑ جائے۔ یہی دوسری صورت انسانی قوت برداشت کے مطابق ہے۔ اب ہمیں یہ تلاش کرنا پڑے گا کہ ان دو وقتوں یعنی ظہر اور عشاء کے درمیان کتنے وقت کی نمازیں پڑھیں۔

دوسری آیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک نماز عشی یا آصال یعنی سہ پہر کے وقت پڑھی جائے جسے ہم عصر کی نماز کہتے ہیں۔ اس طرح چار وقت کی نمازیں ہو گئیں۔ چار وقت میں کوئی نماز بیچ والی نہیں ہو سکتی، اس لئے ایک وقت اور لازماً ماننا ہو گا۔ اور پچھلی آیت کی رو سے وہ وقت مغرب کا ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کی جن آیات میں نماز کے اوقات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سب کا تقاضا یہی ہے کہ نماز پانچ وقت کی فرض ہے۔ جو لوگ صرف تین یا دو نمازیں مانتے

ہیں وہ حقیقت میں قرآن کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ایک ٹکڑے کو لیتے ہیں اور ایک کو چھوڑ دیتے ہیں۔ قرآن میں ایسے لوگوں کیلئے سخت وعید ہے۔ فرمایا گیا۔

﴿ أَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يُرَدُّوْنَ اِلَى اَشَدِّ الْعَذَابِ ﴾

یعنی ایسے لوگوں کے لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں سخت عذاب ہے۔

خلاصہ مباحث

اب تک کے مباحث سے جو باتیں ثابت یا ماخوذ ہوتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) قرآن کو **تبیاناً لکل شیء** یا **تفصیلاً لکل شیء** قرار دینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن میں براہ راست تمام شعبہائے زندگی کا ہر جزئی اور فروعی مسئلہ بیان کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام کے بنیادی ارکان (نماز، زکوٰۃ وغیرہ) تک سے متعلق بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کا براہ راست کوئی بیان قرآن میں نہیں ملتا۔ بلکہ قرآن کے **تبیانا لکل شیء** اور **تفصیلاً لکل شیء** ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن میں ایسے اصول وکلیات، بنیادیں، مراجع، مآخذ، اور سرچشمے بتلا دئے گئے ہیں جن کے ذریعہ کسی بھی مسئلہ سے متعلق اسلامی شریعت کا حکم، منشا اور موقف معلوم اور متعین کیا جا سکتا ہے۔ اور اس طرح ہر وہ مسئلہ جو براہ راست قرآن میں موجود نہیں اسے قرآن کی فراہم کردہ ان بنیادوں پر حل کیا جا سکتا ہے۔

(۲) قرآن کی فراہم کردہ ان بنیادوں اور سرچشموں میں خود قرآن کے علاوہ سب سے اہم سرچشمہ آنحضورﷺ کی ذات رسالت مآب ہے۔ آپ اپنی پیغمبرانہ حیثیت میں صرف اسی بات پر مامور نہیں تھے کہ ایک ڈاکیہ کی طرح لوگوں تک کلام الٰہی پہنچا

دیں، یا ایک اناؤنسر کی طرح اسے پڑھ کرسنا دیں اور بس (جیسا کہ منکرین حدیث کہتے ہیں)۔ بلکہ آپ قرآن مجید کے شارح' معبر اور توضیح کنندہ بھی تھے، اس امت کے حاکم وفرمانروا بھی تھے' قائد ورہنما بھی تھے، معلم اور مربی بھی تھے اور نمونہ تقلید بھی تھے۔ قاضی اور جج بھی تھے، شارع اور قانون ساز بھی تھے۔ آپ کے ذمہ یہ تمام فرائض ومناصب عائد کرنے اور ان تمام اختیارات کو سونپنے کے بعد قرآن نے بے شمار مسائل میں اس لئے خاموشی اختیار کر لی ہے کہ ان مسائل میں آپ کا جو بھی ارشاد اور عمل ہے وہی شریعت کا منشا اور حکم ہے، اسے تسلیم کرنا ایمان کا لازمی جزو ہے۔ کیونکہ ان سارے امور میں آپ اللہ کی مرضی کی نمائندگی اس طرح کرتے تھے جس طرح قرآن کرتا ہے۔

(۳) آپ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کے انہی ارشادات اور کاموں کو سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چونکہ یہ قرآن اپنی مقرر کی ہوئی اس بنیاد اور اس کے لوازم یعنی سنت کو اپنے جلو میں لے کر اور اس کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ کے اس منشا اور قانون برتر کی تشکیل وتکمیل کرتا ہے جسے دین اور شریعت کہا جاتا ہے اس لئے جو لوگ اس سنت کا انکار کرتے ہوئے قرآن کے ماننے کے دعویدار ہیں وہ درحقیقت قرآن کے بھی منکر ہیں۔ کیونکہ وہ اس بنیاد ہی کے منکر ہیں جسے قرآن نے دین کا رکن' ایمان کا لازمی جز واور آخرت کی کامیابی کا دارومدار قرار پایا ہے بلکہ خود قرآن بھی ہمارے نزدیک اس لئے مستند ہے کہ وہ اسی مستند بنیاد (پیغمبر ﷺ) کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ یعنی مسلمان اس لئے قرآن کو کلام الٰہی مانتے ہیں کہ وہ اس رسول کے ذریعہ ان تک پہنچا ہے جس کی رسالت پر وہ ایمان رکھتے ہیں۔

(۴) اسی طرح جو لوگ اس سنت کا انکار کرتے ہوئے دین کو کامل ماننے کے دعویدار ہیں ان کا دعویٰ درحقیقت ایک جھوٹے اور پرفریب نعرہ کے سوا کچھ نہیں۔ کیونکہ آنحضور ﷺ

کی رسالت پر اس کے پورے اجزاء اور مکمل معانی سمیت ایمان لانا اور اس کے لوازم کو تسلیم کرنا دین کا اہم ترین بنیادی رکن اور جزو ہے۔ اور یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کے ان تمام مذکورہ بالا مناصب اور اختیارات میں سے (تلاوت قرآن کے علاوہ) کسی کو بھی تسلیم نہیں کرتے جنھیں قرآن نے رسالت کے اٹوٹ اجزا قرار دیا ہے۔ اور نہ ان مناصب کے ان لوازم اور نتائج ہی کو تسلیم کرتے ہیں جنھیں سنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ لوگ قرآن پر اور رسالت پر ایمان لانے اور دین کو مکمل ماننے کے دعویدار تو ہیں لیکن ان کے نزدیک نہ تو رسالت کا وہ تصور قابل قبول ہے جو تصور قرآن فراہم کرتا ہے۔ اور نہ یہ لوگ دین کی وہ بنیادیں ہی تسلیم کرتے ہیں جن پر قرآن نے دین کی عمارت کھڑی کی ہے۔ نہ ان کے نزدیک وہ نتائج ہی قابل قبول ہیں جو قرآن کی متعین کی ہوئی بنیادوں سے لازماً برآمد ہوتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ قرآن قرآن کی جو رٹ اور دین کامل، دین کامل کا جو نعرہ لگاتے پھر رہے ہیں وہ خود فریبی یا فراڈ کے سوا کچھ نہیں۔ یہ لوگ نہ حقوق رسالت کو تسلیم کرتے ہیں، نہ قرآن کو مانتے ہیں۔ نہ دین کو کامل مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کی اپنی عقلی تک بندیاں اور کج فہمیاں ہی رسالت، قرآن اور دین کامل سب کچھ ہیں۔

(۵) قرآن کو ماننے کا دعویٰ کرنا اور اس کی مقرر کی ہوئی بنیادوں اور مراجع کو نہ ماننا رسول کی رسالت پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنا، اور ان کے مناصب رسالت کو نہ ماننا دین کے کامل ہونے کا نعرہ لگانا اور اس کے بے شمار اجزا کو نہ ماننا انکار حدیث کا وہ لازمی نتیجہ ہے جس نے منکرین حدیث کے موقف کو انتہائی مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ اور علم وعقل کی دنیا میں انھیں کہیں کا بھی نہیں چھوڑا ہے۔

(٦) چونکہ قرآن نے اسوۂ رسول کی پیروی کو ایمان کا جزو اور آخرت کی کامیابی کا مدار ٹھہرایا ہے۔ اور اسوۂ رسول معلوم کرنے کا ذریعہ سنت ہی ہے۔ اس لئے جو لوگ

قرآن پر ایمان کا دعویٰ رکھتے ہوئے سنت کو قابل اعتبار نہیں مانتے، یعنی بالفاظ دیگر یہ کہتے ہیں کہ اسوۂ رسول محفوظ ہی نہیں رہ گیا ہے۔ وہ درحقیقت یہ کہتے ہیں کہ قرآن ایک ایسی چیز کو ایمان کی شرط اور نجات کا مدار قرار دے رہا ہے جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جو نا قابل عمل اور انسانی طاقت سے باہر ہے۔ بلکہ نعوذ باللہ وہ اللہ کے ساتھ یہ بدگمانی کئے بیٹھے ہیں کہ وہ اس قدر عاجز و درماندہ ہے کہ جس چیز کو اس نے نجات آخرت کا مدار قرار دیا اس کی حفاظت ہی نہ کر سکا۔ اور چند انسانوں کی ''سازش'' کے مقابل میں بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا۔

(۷) ان منکرین سنت نے حدیث کو نا قابل اعتبار قرار دینے کے لئے جتنے اصول ایجاد کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ان اصولوں کی زد خود قرآن کی صحت اور اس کی استنادی حیثیت پر پڑتی ہے۔ اور ان کے معیار پر (پرکھنے) کے بعد قرآن کا اعتبار اور اس کی آبرو بھی سلامت نہیں رہ جاتی۔

(۸) قرآن میں ''ظن'' کی صرف مذمت ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ اس کی مدح و توصیف بھی کی گئی ہے۔ اس کی بنیاد پر فیصلہ کن رائے قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسے آخرت کی کامیابی کا مدار ٹھہرایا گیا ہے۔ بہت سے شرعی احکام کی بنیاد اسی ظن پر رکھی گئی ہے۔ اور قرآن نے پوری اسلامی عدالت کے فیصلوں کا نظام بھی اسی ظن پر قائم کیا ہے۔ اس لئے احادیث کو ظنی کہہ کر انھیں رد کر دینا زیادتی اور قطعی ناانصافی ہے۔ کیونکہ احادیث بھی انھیں معنی میں ''ظنی'' ہیں جن معنی میں ظن قرآن کے نزدیک پسندیدہ اور قابل اعتماد ہے۔

(۹) یہ بات قطعی غلط اور یکسر بے بنیاد ہے کہ کتب احادیث کی روایات قصہ گویوں، داستان سراؤں، واعظوں اور زید، عمرو، بکر جیسے نا قابل اعتبار لوگوں کی زبان پر سینکڑوں سال تک بے روک ٹوک گشت کرتی رہیں۔ اور بعد میں انھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب

کر کے ان پر صحیح ہونے کا لیبل لگا دیا گیا۔ بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ کتب احادیث میں جو روایات درج ہیں یہ رسول اللہ ﷺ کا وہ اسوہ یعنی آپ کے وہ اقوال وافعال ہیں جنھیں آپ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی کے دوران آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جیسے مقدس اور پاکیزہ گروہ نے دیکھا اور سنا۔ اور اپنی زندگی کے تمام عملی گوشوں میں انھیں نافذ کیا۔ پھر صحابہ کرام سے تابعین کے اس راست باز گروہ نے انھیں حاصل کیا جن کی راستبازی پر خود قرآن کی شہادت موجود ہے۔ ان دونوں گروہوں نے اسوۂ رسول کو جزو ایمان اور مدار نجات سمجھ کر اس سلسلہ کی ایک ایک بات جو ان کے علم میں آئی ہمہ طور اس کی حفاظت کی۔ بعض نے بیاضوں اور یادداشتوں کے اندر بھی انھیں ثبت کر لیا۔ اسوۂ رسول کا یہ محافظ اور علمبردار گروہ ابھی دنیا میں موجود ہی تھا کہ ان آئمہ حدیث کا وجود ہو گیا جن کی ثقاہت، عدالت، تقویٰ، راست بازی، علم اور فراست کی نظیر سے دنیا کی ساری امتیں اور قومیں خالی رہی ہیں۔ انھوں نے تحقیق و جستجو کے نہایت ہی کڑے معیار پر جانچ پرکھ کر اسے باقاعدہ مدون کرنا شروع کیا۔ اور پورے تاریخی ارتقاء اور تسلسل کے ساتھ۔

(۱۰) یہ انکشاف بھی قطعی طور پر ایک بدبودار افسانہ ہے کہ جامعین حدیث ایرانی یا عجمی تھے۔ اور تدوین کا کام انھوں نے دین اسلام کے خلاف ایک سازش کے طور پر کیا تھا۔

(۱۱) یہ معیار بھی قطعی غلط ہے کہ کوئی چیز اسی وقت قابل اعتماد ہو سکتی ہے جبکہ وہ علی الفور قید کتابت میں آ چکی ہو۔ اس معیار کو صحیح تسلیم کر لینے کے بعد تاریخ کے مسلمہ واقعات میں سے کوئی بھی واقعہ قابل اعتماد باقی نہیں رہ سکتا۔ خود قرآن میں بہت سارے ایسے واقعات درج ہیں۔ جو اپنے وقوع کے ہزارہا ہزار برس کے بعد قید کتابت میں لائے گئے ہیں۔ بلکہ بذات خود قرآن کے بھی قابل اعتماد ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ

نزول کے فوراً بعد قید کتابت میں آ جاتا تھا۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ لاکھوں صحابہ اور کروڑوں تابعین تک قرآن کی رسائی کا ذریعہ محض زبانی نقل و روایت ہے۔ اور قرآن اس لئے قابل اعتماد ہے کہ وہ حضورﷺ جیسے قابل اعتماد انسان سے صحابہ تک پہنچا۔ اور صحابہ جیسے قابل اعتماد انسانوں سے تابعین تک۔ اور پھر ایسی ہی ترتیب کے ساتھ درجہ بدرجہ ہم تک پہنچا۔ خود موجودہ زمانہ کا لکھا ہوا اور چھپا ہوا قرآن اس لئے قابل اعتماد نہیں ہے کہ وہ لکھا ہوا یا چھپا ہوا ہے۔ بلکہ اس لئے ہے کہ اس کے صحیح اور قابل اعتماد ہونے پر امت کی شہادت موجود ہے۔ اسی طرح پچھلے دور کا لکھا ہوا اگر قرآن کا نسخہ دستیاب ہو جائے تو وہ اس وقت تک قابل اعتماد نہیں ہو سکتا جب کہ وہ قرآنی الفاظ، آیات اور سورتوں کی ترتیب وغیرہ سے متعلق امت کی اجتماعی شہادت کے مطابق نہ ہو۔

(۱۲) احادیث صحیحہ کو متفرق اور متضاد کہنا یا انھیں دروغ بافی، فحش نگاری اور الزام تراشی کا مرقع قرار دینا بھی سراسر ظلم ہے۔ احادیث صحیحہ کی جس طرح کی باتوں کو منکرین حدیث تفرق اور تضاد سے تعبیر کرتے ہیں۔ یا دروغ بافی، فحش نگاری اور الزام تراشی کا مرقع قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح کی باتیں یا خود وہی باتیں قرآن کے اندر بھی پائی جاتی ہیں۔

(۱۳) یہ ضابطہ بھی محض زبردستی ہے کہ اگر احادیث کی صحت تسلیم کر لی جائے تو اِن اَن گنت راویوں پر ایمان لانا ہوگا جو ان کے سلسلہ اسناد میں پڑتے ہیں۔ حالانکہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان پر ایمان لانے کے لئے مکلّف نہیں کیا گیا ہے۔ یہ ضابطہ اس لئے بھی غلط ہے کہ اس کو تسلیم کرنے کے معنی تو یہ ہوئے کہ قرآن کی صحت تسلیم کرنے کے لئے اس امت کے تمام نیک و بد مردوں اور عورتوں پر ایمان لانا ہوگا۔ کیونکہ قرآن انہی کے اجتماعی نقل و تواتر سے ہم تک پہنچا ہے۔

(۱۴) قبر کا عذاب و ثواب برحق ہے۔ یہ قرآن اور حدیث (دونوں) سے ثابت ہے۔ اور

اس کا منکر جس طرح حدیث کا منکر ہے اسی طرح قرآن کا منکر ہے۔

(۱۵) نماز کے سلسلے میں منکرین حدیث کے درمیان جو سخت زبردست بنیادی اور اہم اختلافات پائے جاتے ہیں ان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر سنت سے آزاد ہوکر قرآن کی شرح وتعبیر شروع کر دی جائے تو اسلام کے بنیادی ارکان تک کی آبرو سلامت نہیں رہ سکتی۔ اور امت ایسے شدید بحرانی اختلاف کا شکار ہو جائے گی کہ یہود ونصاریٰ کے اختلاف ان کے سامنے ہیچ ہوں گے۔ اور پھر اس امت کے لئے کوئی نقطہ اتحاد واجتماع تلاش کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے برخلاف سنت کی پابندی اس اختلاف کو اس حد تک محدود کر دیتی ہے کہ اسے قریب قریب ختم ہی کر دیتی ہے۔ خود نماز کے معاملہ میں چند ایک فروعی قسم کے مسائل کو چھوڑ کر اہل سنت کے درمیان تمام مسائل میں اتفاق ہے۔ اور مختلف فیہ مسائل میں بھی اختلاف یا تو محض فضلیت و مفضولیت کا ہے یا فہم وتعبیر کا۔

(۱۶) نماز پنجگانہ کا ثبوت متواتر احادیث سے بھی ہے۔ اور امت کے اجتماعی اور اجماعی تعامل سے بھی ہے۔ پھر قرآن کے اشارات وتعبیرات اور اس کا پیرایہ بیان بھی اسی کا تقاضا اور اسی کی تائید کرتا ہے۔ جو لوگ دو یا تین یا چھ وقتوں کی نماز کے قائل ہیں وہ ان کھلے ہوئے حقائق کے منکر ہیں جن سے انکار کی گنجائش دنیا کے کسی بھی اصول اور ضابطہ کی رو سے موجود نہیں۔ اور جن کا انکار درحقیقت قرآن کا انکار اور حاملین قرآن کی تکذیب ہے۔

هٰذَا آخِرُ مَا اَرَدْنَا اِیْرَادَهُ،

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وآخِرًا وَظَاهِرًا وَبَاطِنًا اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنَا اِتِّبَاعَهُ، وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنَا اِجْتِنَابَه۔